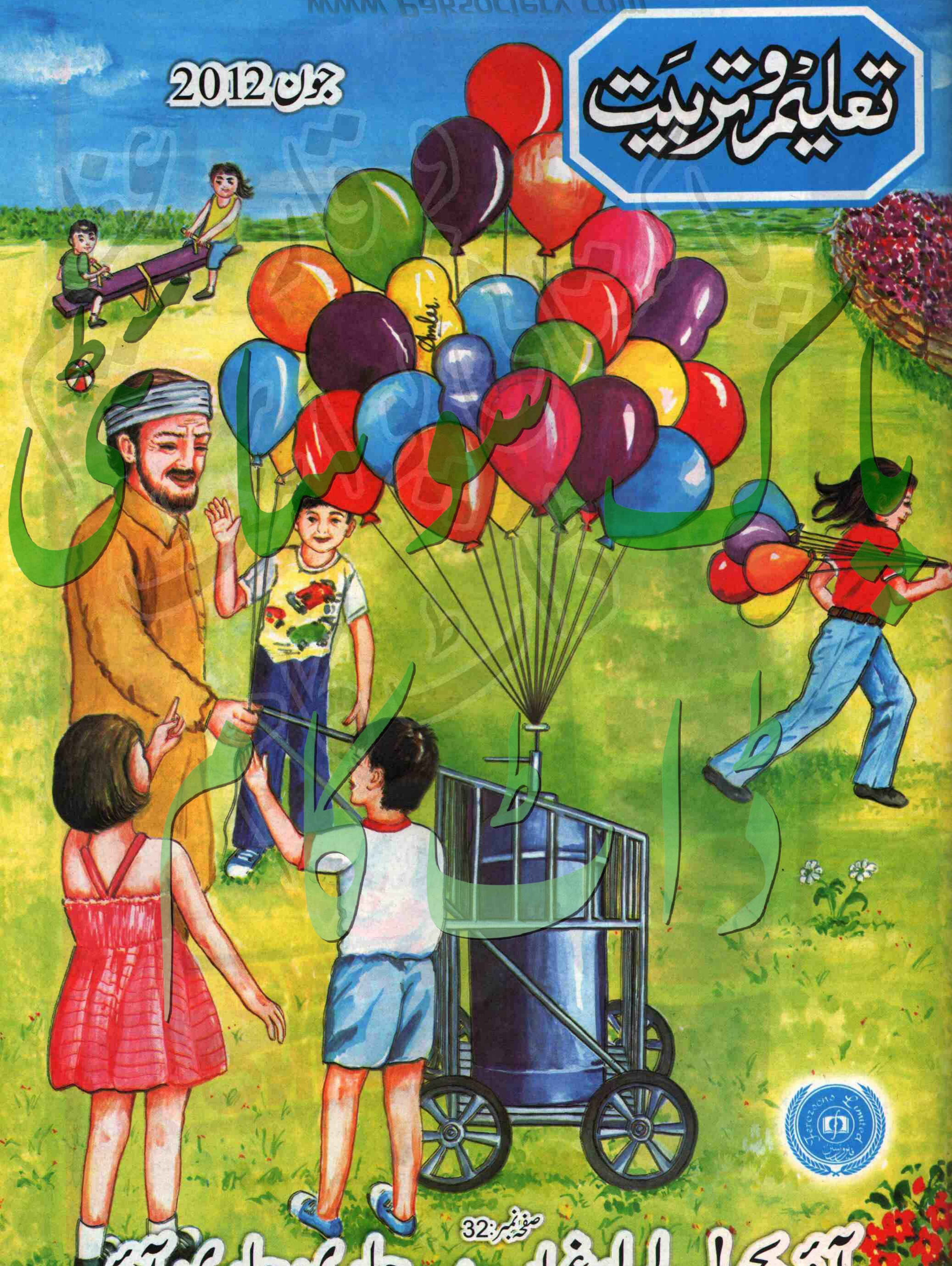
تعلیم و تربیت

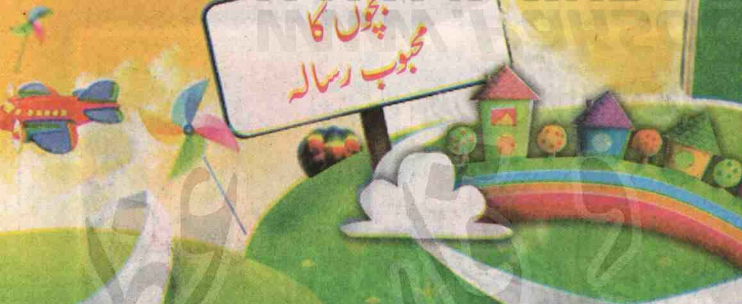
جون 2012



صفحہ نمبر: 32

آؤ بچو! لے لو غبارے، جلدی جلدی آؤ

www.Paksociety.com



تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
72 واں سال دُوسرا شمارہ
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
جون 2012ء

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: غبارے والا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے تو انہوں نے بلاوجہ آپ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ آپؑ انہیں دُعائیں دیتے ہوئے وہاں سے چل پڑے۔ یہ دیکھ کر ایک شخص نے کہا: ”اے اللہ کے نبی آپؑ نے ان شریروں کے شر کے بدلے میں جس خیر و رحمت کا مظاہرہ فرمایا ہے کہیں یہ انہیں غرور میں مبتلا نہ کر دے۔“

یہ سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ”انسان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ دُوسروں کو وہی چیز دیتا ہے، ان کے پاس شر ہے جب کہ میرے پاس خیر ہی خیر ہے۔“

بیرم خاں مغل بادشاہ اکبر کا سپہ سالار اور اُس کا استاد تھا۔ ایک شخص نے تاک کر ایک پتھر اُسے دے مارا۔ جب اُسے پتھر لگا تو اُس نے گھوڑا روک لیا اور اپنے خادم کو حکم دیا کہ پتھر مارنے والے شخص کو اشرفیوں کی ایک تھیلی دے دو۔ خادم نے اُسے تھیلی دے دی اور وہ شخص تھیلی لے کر چلا گیا۔ خادم نے حیران ہو کر پوچھا:

”اُس شخص نے آپ کو پتھر مارا اور آپ نے اُسے اشرفیوں کی تھیلی دے دی، آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟“

بیرم خاں نے مسکرا کر کہا: ”پھل دار درخت کو جب لوگ پتھر مارتے ہیں تو درخت انہیں پھل دیتا ہے، جواب میں پتھر نہیں مارتا۔“

شر کا جواب شر سے دینا کون سا مشکل کام ہے، جب کہ شر کا جواب خیر سے دینا نہایت مشکل کام ہے کیوں کہ جب کوئی آپ کو بُرا بھلا کہتا یا تنگ کرتا ہے تو آپ کو اُس پر غصہ آتا ہے، جس کے باعث آپ اُس سے بدلہ لینے کا ارادہ کرتے ہیں، اس موقع پر غصے پر قابو رکھنا، بُرائی کرنے والے کے ساتھ بھلائی کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ حضورﷺ نے تمام عمر اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ آپﷺ نے ہر موقع پر عفو و درگزر سے کام لیا۔ ہمیں چاہیے کہ آپﷺ کے نقشِ قدم پر چلیں تاکہ دُنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکیں۔

اسی ماہ سے آپ کو موسمِ گرما کی چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ آپ ہم سے وعدہ کریں کہ نہ تو آپ ان چھٹیوں کو ضائع کریں گے اور نہ گرمی میں فضول گھومیں گے۔ ان چھٹیوں کو مفید بنانے کے لیے ابھی سے ٹائم ٹیبل بنا لیں اور اس پر سختی سے عمل کریں۔ ہم آپ کے لیے دُعا گو ہیں۔ آپ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

چیف ایڈیٹر: عبد السلام
ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام
اسسٹنٹ ایڈیٹر: نذیر انبالوی
مشیر: سعید لخت
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ”تعلیم و تربیت“ 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361310-36361309 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
AN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔
ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 25 روپے



درسِ قرآن و حدیث

محمد طیب الیاس

کامل مسلمان کی پہچان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

''جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر کسی قصور کے تکلیف پہنچاتے ہیں تو وہ لوگ بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ (الاحزاب، آیت: 58)

تکلیف پہنچانا کبھی زبان سے ہوتا ہے کہ کسی کو گالی دے دی یا ویسے بُرا کہہ دیا۔ یا اس پر ایسا جملہ کسا جس سے وہ ناراض ہو گیا یا کسی کے ذمہ ایسی بات لگانا جس کو اُس نے نہ کیا ہو جس کو بہتان یا تہمت کہتے ہیں۔ کبھی جسمانی اعضاء سے تکلیف پہنچائی جاتی ہے کہ کسی کو تھپڑ مار دیا یا گھونسہ رسید کیا، کسی کا بازو مروڑ دیا یا دھکا دے دیا۔ یہ سب گناہ کے کام ہیں۔

کہنے کو تو ہر وہ شخص مسلمان ہے جس نے کلمہ پڑھ کر توحید و رسالت کا اقرار کیا، لیکن ایک کامل مسلمان کی پہچان حدیث میں یوں بیان کی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دُوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔'' (بخاری، مسلم)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

''مسلمانوں کو ستایا نہ کرو، اُن کو شرم نہ دلایا کرو اور ان کے عیوب کی تلاش نہ کرو۔'' (صحیح ابن حبان)

اپنے مسلمان بھائی کو کسی فعل پر بلاوجہ شرم دلانا یا اس کے عیوب تلاش کرنا اور ان کی جستجو کرنا بھی اس کو تکلیف پہنچانا ہے جس سے منع فرمایا ہے۔ ایک مثالی اور پُرامن معاشرہ کا قیام تبھی ممکن ہوتا ہے جب کہ اس میں قیام پذیر ہر فرد سے دُوسرا فرد محفوظ ہو، کوئی کسی کو تکلیف پہنچانے کے درپے نہ ہو اور ہر ایک دُوسرے کے آرام و راحت کا مکمل خیال رکھے۔ اور جس معاشرہ میں ایک دُوسرے کے آرام کا خیال نہ رکھا جائے، عزت نفس کو مجروح کیا جائے تو پھر معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے، فتنہ و فساد عام ہوتا ہے اور لڑائی جھگڑا جڑ پکڑتا ہے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

''اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آئے اور بدترین بندے چغلیاں کھانے والے، دوستوں میں جدائی ڈالنے والے اور اللہ تعالیٰ کے پاک دامن بندوں کو کسی گناہ یا کسی پریشانی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرنے والے ہیں۔'' (مسند احمد)

اس حدیث میں بہترین لوگ ان کو قرار دیا ہے جو بے ضرر ہوں، اُن سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے اور اُن کا کردار اس قدر اجلا وصاف ہو کہ دُوسرے لوگ اُن سے راہ نمائی حاصل کریں، اُن کو دیکھ کر خدا یاد آئے، نیکی کا شوق پیدا ہو اور طبیعت اُن جیسی بننے پر آمادہ ہو جائے۔ جب کہ وہ بندے انتہائی بُرے قرار دیئے گئے جو دوستوں میں جدائی ڈلواتے ہیں، فتنہ و فساد پھیلانا اور دُوسروں کو پریشان کرنا اُن کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔

پیارے بچو! کسی کو تکلیف دینا اتنی بُری بات ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ناراض ہو جاتے ہیں اور جس سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو جائیں بھلا وہ خوش رہ سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

''جس نے کسی مسلمان کو تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے یقیناً اللہ تعالیٰ کو تکلیف دی یعنی اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا۔'' (طبرانی صغیر)

قرآن مجید

بے شک یہ قرآن رب کا ہے فرمان
شک کا کیا امکان اپنا ہے ایمان
حق کا ہے اعلان
سچا ہے قرآن

ہے یہ کتابِ حکمت پاک نبیؐ کی شریعت
ہے یہ موجبِ رحمت اور ہے باعثِ برکت
حق کا ہے اعلان
سچا ہے قرآن

ہے یہ نورِ ہدایت اور ہے حق کی عنایت
اس کی کرنا تلاوت اپنے رب کی عبادت
حق کا ہے اعلان
سچا ہے قرآن

قصے بھی سناتا ہے عبرت بھی دلاتا ہے
مومن کی ہدایت کو مسئلے بھی بتاتا ہے
حق کا ہے اعلان
سچا ہے قرآن

قرآن اگر ہم پڑھ لیں اور مطلب، اس کا سمجھ لیں
بن جائیں گے دین و دُنیا گر اس پر عمل ہم کر لیں
حق کا ہے اعلان
سچا ہے قرآن

محمد انوار احمد



علی اکمل تصور

سزا

شیشے کا نازک سا گلاس مصباح کے ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔ یہ گلاس جوس سے بھرا ہوا تھا۔ گلاس بجلی کی سی تیزی سے سنگ مرمر کے فرش کی طرف لپکا۔ یہ وہ سفر تھا جس میں گلاس کو فنا ہونا تھا۔ ایک زور دار چھناکے کی آواز فضا میں گونجی اور پھر فرش سے ٹکرانے کے بعد گلاس کی کرچیاں فضا میں بلند ہوئیں۔ ایک انجانے خوف کی وجہ سے مصباح کے گلے سے دبی دبی چیخ کی آواز نکل گئی۔ ہال میں موجود تمام لوگ مصباح کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ مصباح کی امی ساتھ والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ مصباح گھر میں تو غفلت کا مظاہرہ کرتی ہی تھی، لیکن یہاں ہوٹل میں بھی اُس نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا تھا۔ پھر امی کی آنکھوں میں خوف کے آثار نظر آئے۔ ایک آدمی کھا جانے والی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مصباح کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اُس نے پہلے ہی اُس آدمی کو تاڑ لیا تھا۔ وہ کاؤنٹر کے پاس کھڑا تھا۔ اور اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ آدمی اس ہوٹل کا مالک تھا۔ گلاس ٹوٹنے والا معاملہ دیکھ کر ایک ویٹر اپنے مالک کے پاس دوڑ کر پہنچا تھا۔

"سر! آپ غصہ مت کیجیے...... بچی ہے...... گلاس ٹوٹ گیا کوئی بات نہیں...... نیا آ جائے گا......" ویٹر اپنے طور پر بغیر کسی تعلق کے مصباح کا دفاع کر رہا تھا۔

"ہاں نیا آ جائے گا...... لیکن گلاس ٹوٹا ہے...... پیچھے ہٹو......"

ویٹر نے اپنے مالک کا راستہ روک رکھا تھا۔ مالک اُسے ایک طرف دھکیل رہا تھا۔

"پیچھے ہٹو...... تم مجھے کیوں روک رہے ہو...... میرا راستہ چھوڑو......"

وہ بہت غصے میں نظر آ رہا تھا۔ ویٹر کی کیفیت بہت عجیب سی تھی۔ اگر وہ مالک کے ساتھ الجھتا تو نوکری خطرے میں تھی اور اگر وہ اُسے جانے دیتا تو غصے میں مالک کے تلخ رویے سے ہوٹل کی بدنامی ہوتی۔ دونوں طرف مصیبت تھی۔ اس ویٹر کا نام ناصر تھا۔ وہ پچھلے چھ ماہ سے اس ہوٹل میں کام کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کا مالک دل کا بہت اچھا ہے، لیکن غصے کا بہت تیز ہے۔ کوئی غلط بات، کوئی غلط کام وہ کبھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ نوکر اور مالک کی اس بحث نے ہال میں موجود تمام لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ کچھ چہ مگوئیاں بھی کر رہے تھے۔ حادثہ اتنا بڑا تو نہیں تھا۔ بس ایک گلاس ہی ٹوٹا تھا۔ پھر اتنی شدت دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ تھوڑی سی بحث کے بعد آخر ناصر نے ہار مان لی۔ اب مالک مصباح کی طرف بڑھا۔ مصباح کا چہرہ اچانک ہی پیلا ہو گیا تھا۔ امی پہلے ڈر رہی

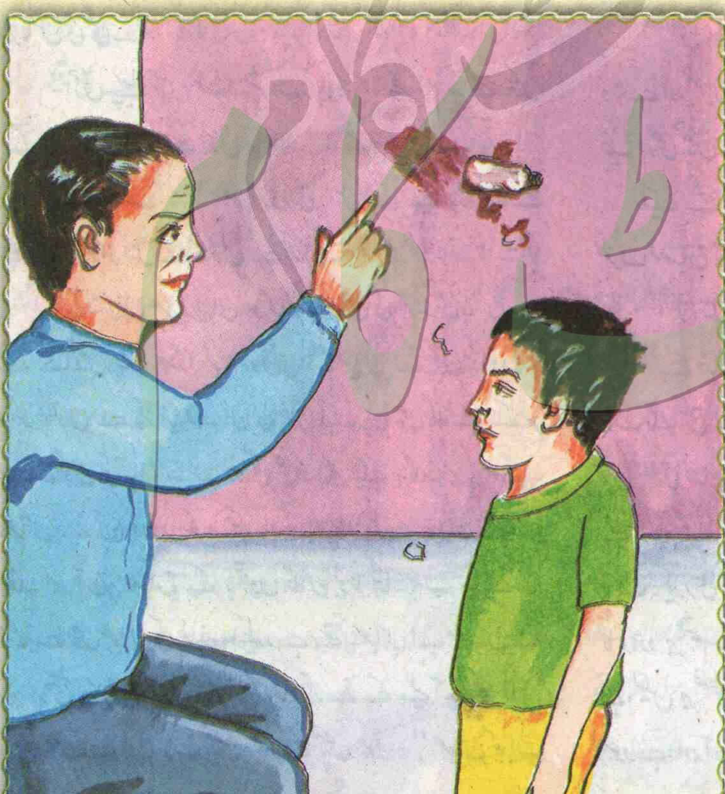
تھیں۔ اب ڈر کی جگہ گھبراہٹ نے لے لی تھی۔ اور ہوٹل کے مالک کا ہر اٹھتا قدم ان کے درمیان کی دُوری کو کم کر رہا تھا۔

ہوٹل کے مالک کا نام عباس تھا۔ عباس جب چھوٹا تھا تو اُس سے بھی اس قسم کے نقصان ہو جاتے تھے اور کبھی نہیں بھی ہوتے تھے۔ تب بھی اُسے سزا ضرور ملتی تھی۔ اُسے ملنی والی پہلی سزا بہت عجیب سی تھی۔ تب وہ چھ سال کا بچہ تھا۔ اور سکول میں اول جماعت کا طالب علم تھا۔ امی ابو سکول جانے سے پہلے اُسے صرف ایک ہدایت کرتے تھے۔

''بیٹا! چاکلیٹ یا بسکٹ کھانا، پاپڑ مت کھانا۔ ورنہ تمہارا گلا خراب ہو جائے گا۔ گلا خراب ہوا تو بخار ہو جائے گا......'' عباس ہاں کے انداز میں سر ہلا دیتا، لیکن کیا کیجیے۔ عباس کو میٹھی چیزیں پسند نہیں تھیں اور نمکین بسکٹ وہ کب تک کھاتا۔ ویسے بھی مصالحے والے پاپڑ اُسے بہت پسند تھے۔ وہ مختلف ذائقوں والے پاپڑ کھاتا رہتا اور پھر ایک دن امی ابو کا خوف حقیقت بن کر اُن کے سامنے آ گیا۔ عباس کا گلا خراب ہو چکا تھا۔ اور وہ بُری طرح کھانس رہا تھا۔ ابو اُسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد عباس کے لیے انجکشن تیار کیا۔ سوئی لگاتے وقت عباس نے چیخ چیخ کر درو دیوار کو ہلا کر رکھ دیا۔ راہ چلتے لوگ رُک گئے۔ وہ تو ابو کی گرفت مضبوط تھی۔ ورنہ عباس بھاگ جاتا۔ ڈاکٹر ہنستے ہوئے صرف ایک بات کہہ رہا تھا۔

''بیٹا! شور مت کرو۔ میرے مریض بھاگ جائیں گے......'' پھر ڈاکٹر نے ابو کو ایک شیشی دی۔ اس میں اینٹی بائیوٹک پاؤڈر تھا۔ ابو نے دوا تیار کرنے کا طریقہ سمجھ لیا تھا۔ دوا تیار ہوئی، لیکن اب عباس دوا پینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جیسے تیسے کر کے ابو نے اُسے دوا کا ایک چمچ دیا۔ عباس کے حوالے سے غصہ ان کے دل میں پل رہا تھا۔ انہیں اس سارے عمل میں عباس کی غلطی نظر آ رہی تھی۔ دوا کی اگلی خوراک دینے کا وقت آیا تو عباس نے پھر سے شور وغل مچا دیا۔ اُسے دوا کڑوی لگتی تھی۔ ابو نے زبردستی کی تو عباس نے منہ میں موجود دوا اگل دی۔ بس پھر کیا تھا۔ ابو کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے دوا کی شیشی دیوار پر دے مار اور عباس کو خوب بُرا بھلا کہا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اس کی ہر غلط حرکت پر ابو اُسے ڈانٹنے لگے تھے۔ وہ دس سال کا تھا جب اُسے پہلی بار مار پڑی تھی۔ اُس نے کمرے کی ٹیوب لائٹ توڑ دی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ دونوں ایک دُوسرے کی طرف گیند پھینک رہے تھے۔ عباس نے جو زور سے گیند پھینکا تو وہ دیوار سے ٹکرا کر ٹیوب لائٹ کو جا لگا۔ ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ شیشے کے ٹکڑے کمرے میں بکھر گئے تھے۔ دھماکے کی آواز سن کر ابو سناٹے میں آ گئے اور پھر جیسے ہی انہیں بات کی سمجھ آئی انہوں نے عباس کے رخسار پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔

شیشے کی کرچیاں تب بھی فضا میں بکھری تھیں۔ شیشے کی کرچیاں آج بھی فضا میں بکھری تھیں۔ تب ابو کے سامنے عباس تھا۔ آج عباس کے سامنے مصباح تھی۔ اور مصباح سے عباس کا



کوئی رشتہ نہیں تھا۔

ابو کے سخت رویے نے عباس کی تربیت پر اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ ضدی ہو گیا تھا۔ ہٹ دھرمی سے کام لینے لگا تھا۔ اُس کے مزاج میں چڑچڑا پن آ گیا تھا۔ اور غصہ تو برداشت سے باہر تھا۔ ابھی کل کی بات تھی۔ دو نوجوان ہوٹل میں داخل ہوئے۔ وہ شوخی کے موڈ میں نظر آ رہے تھے۔ ایک ٹیبل کے گرد کرسیوں پر بیٹھتے ہی انہوں نے اپنی انگلیوں سے میز بجانا شروع کر دیا۔ عباس کے ہوٹل میں سلجھے ہوئے گھرانوں کے لوگ کھانا کھانے کے لیے آتے تھے۔ بہت کم وقت میں اس ہوٹل نے اچھی ساکھ بنا لی تھی اور آج پہلی بار دو من چلے ہوٹل میں آئے تھے۔ وہ مہذب رویے کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔ ناصر دوڑ کر اُن کی طرف گیا۔

''کیا لیں گے صاحب؟'' ناصر نے ادب سے پوچھا۔

''تم یوں کرو کہ پہلے ہمیں ٹھنڈا کر دو...... پھر ہمیں گرم کر دو......''

''کیا مطلب......'' ناصر سمجھ نہیں پایا تھا۔ اُس کے لیے یہ فرمائش نئی تھی۔

''احمق پہلے ہمیں ٹھنڈا مشروب پلاؤ...... پھر ہم چائے پئیں گے......'' نوجوان دانت نکال کر بولا۔

''جی صاحب......'' ناصر آرڈر کی تکمیل کے لیے واپس لوٹنے لگا تو ایک آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''رکو......'' ناصر پریشان ہو گیا۔ یہ عباس کی آواز تھی۔

''نہیں میں ٹھنڈا کرتا ہوں......'' عباس نے اُن دونوں کو گریبانوں سے پکڑ لیا تھا۔ اُن کی خوشی ایک پل میں گدھے کے سر سے سینگوں کی مانند غائب ہو گئی تھی۔ پھر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ عباس نے اُن دونوں کو دھکے مار کر اپنے ہوٹل سے باہر نکال دیا تھا۔ اور آج مصباح کے ہاتھوں گلاس ٹوٹا تھا۔ سب سناٹے کی کیفیت میں عباس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عباس اب مصباح کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ ناصر دوبارہ بیچ بچاؤ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

''جناب کوئی بات نہیں...... کچھ نہیں ہوا......'' عباس کو اب ناصر پر غصہ آ گیا تھا۔

وصیت

خالد آباد میں شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کا مقبرہ ہے جو اورنگ آباد سے 32 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس کی وصیت تھی کہ اس کی قبر سادہ اور کچی بنائی جائے جس پر کوئی سائبان نہ ہو، اس کی قبر پر وہی رقم خرچ کی جائے جو اس نے زندگی بھر ٹوپیاں سی کر اور قرآن حکیم کی کتابت سے کمائی تھی۔ اس کا مقبرہ انتہائی سادہ اور کم حیثیت ہے۔ اس عظیم شہنشاہ کی سلطنت مشرق میں برما سے لے کر ماضی کے سوویت یونین کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

(محمد زبیر ارشد، ملتان)

''کوئی بات کیوں نہیں...... اور کچھ ہوا کیوں نہیں۔ تم دیکھ نہیں رہے۔ گلاس ٹوٹا ہے، پیچھے ہٹو...... مجھے دیکھنے دو......''

عباس نے ناصر کو مخالف سمت میں دھکیل دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ عباس مصباح کو کچھ کہتا۔ مصباح سہمے سہمے انداز میں بول پڑی۔

''سوری انکل! مجھ سے غلطی ہوئی......''

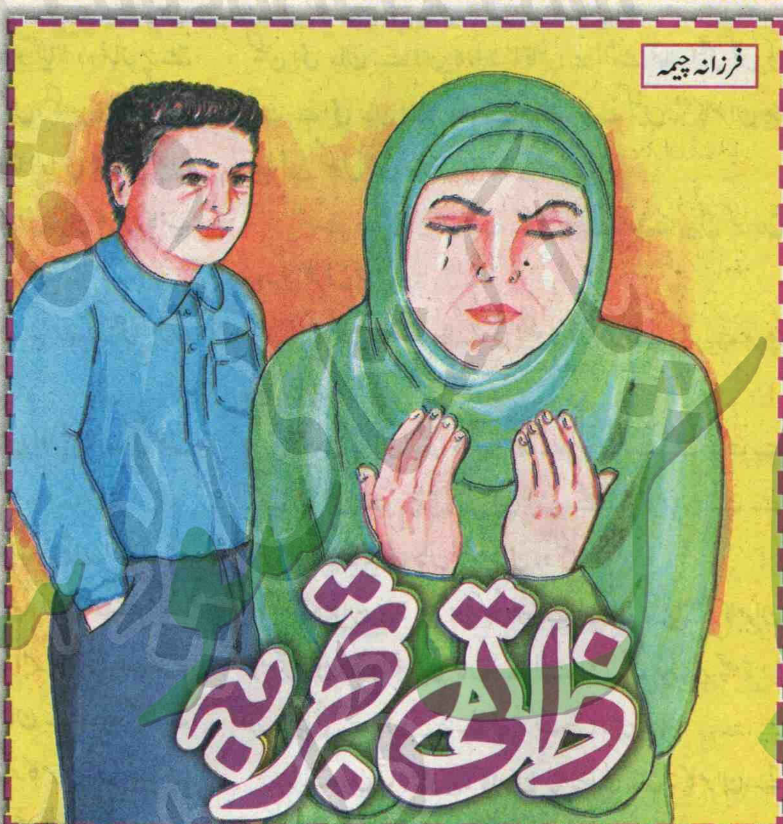
''غلطی...... غلطی کی کیا بات ہے اور مجھے دیکھنے دو......'' گلاس ٹوٹا ہے اور تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔ گلاس کی کرچیاں بہت اُوپر تک اچھلی تھیں۔ تم ٹھیک تو ہو نا......''

ایک لمحے کے لیے ناصر کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ دُوسری طرف مصباح کا چہرہ پھول کی مانند کھل گیا تھا۔

''انکل میں ٹھیک ہوں......'' مصباح بولی۔

''بچے خیال رکھا کرو۔ ناصر شیشے کے ٹکڑے صاف کرو۔ کسی کو چوٹ لگ سکتی ہے۔''

''جی صاحب!'' ناصر کی آواز میں زندگی کی لہر تھی۔ پھر عباس پیچھے ہٹ گیا۔ مصباح اور اُس کی امی مسکراتے ہوئے، عباس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور عباس کو اس لمحے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کا وجود ہر قسم کے بوجھ سے پاک ہو گیا ہو۔ ہر غلطی کی سزا ہوتی ہے، لیکن ہر غلطی سزا دینے کے قابل نہیں ہوتی۔ درگزر کا اپنا ایک وجود ہے، اور آج عباس نے درگزر کا رویہ اپنا کر اپنے ابو کے رویے کو جواب دینے کی کوشش کی تھی کہ میرا راستہ آپ سے مختلف ہے۔



ذاتی تجربہ

فرزانہ چیمہ

آج کی بات نہ تھی گزشتہ ہفتے سے کامران کا ایسا بُرا رویہ امی جان کی سمجھ سے باہر تھا۔ فیضان اور کامران دو ہی بچے ان کی کُل کائنات تھے۔ فیضان اسلام آباد میں ایک بڑے تعلیمی ادارے کے ہوسٹل میں مقیم تھا جب کہ کامران اپنے ہی شہر کے ایک اچھے سکول میں آٹھویں میں پڑھتا تھا۔ دونوں بچے نہایت تمیز دار، لائق اور والدین کے فرماں بردار تھے۔

تمام رشتہ دار ان بچوں کی مثال دیتے ہوئے کہتے تھے کہ منور صاحب کے بچے کتنے اچھے ہیں۔ صورت و شکل تو اللہ کے اختیار میں ہوتی ہے اور اس میں بھی اللہ نے انہیں پیچھے نہیں رکھا تھا، لیکن اخلاق اور تعلیم تو انسان کے اپنے بس کی بات ہوتی ہے۔ جتنا کوئی چاہے محنت کر کے نام پیدا کر سکتا ہے۔ منور صاحب کی بیگم عام خواتین سے بڑی مختلف تھیں۔ عام عورتوں کی طرح نت نئے فیشن اور رنگا رنگ لباس پہننے کا انہیں کوئی شوق نہ تھا۔ وہ اپنا پیسہ اور وقت اچھے کاموں پر صرف کرنا زیادہ پسند کرتی تھیں، گھر اور بچے ان کی تمام تر اُمیدوں کا مرکز تھے۔ وہ اپنے بچوں میں ہر اچھی بات دیکھنے کی خواہش مند تھیں اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ان کو خود بھی بچوں کے سامنے ایک نمونہ پیش کرنا پڑتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو نرم لہجے میں بات کرتے دیکھنا چاہتیں تو اس کے لیے وہ خود بھی ان سے نرمی اور محبت کا برتاؤ کرتیں وہ بچوں کو پانچ وقت کا نمازی بنانا چاہتی تھیں تو خود بھی نماز کی پابند تھیں، یوں ان کی محنت خوب رنگ لا رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اللہ سے دُعا مانگا کرتی تھیں کہ وہ سب کو دینے والا ہے اور وہی دیتا ہے تو کسی اور کے آگے سوال کرنے کا، پریشانی ظاہر کرنے کا کیا فائدہ؟ ان دنوں وہ عجیب پریشانی کا شکار تھیں۔ کامران کا رویہ ان کی سمجھ سے باہر

"کامران بیٹے! بجلی کا بل جمع کروا آؤ میں تمہارے آنے تک......"

"میں نہیں جا سکتا۔ مجھے آپ نے ملازم سمجھا ہے کیا؟" کامران نے بات کاٹتے ہوئے بدتمیزی سے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ملازم! یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا، کیا اپنے گھر کے کام کرنا ملازمت میں شمار ہوتے ہیں؟" امی جان نے حیرت سے کامران کو دیکھا۔

"ہاں میرے خیال میں ایسے کام کرنا ملازموں کا کام ہوتا ہے۔" کامران نے کندھے اچکائے اور اپنے کمرے میں جا کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔

امی جان نے حسبِ عادت ایک ٹھنڈی آہ بھری، بڑی سی چادر اوڑھی، بل پکڑا اور خود جمع کروانے کے لیے چل دیں۔ کامران نے گیٹ بند ہونے کی آواز سنی تو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا، بھاگتے ہوئے باہر گیا، لیکن امی جان تو جا چکی تھیں۔ اس نے بے چینی سے اپنے ہونٹ کاٹے اور سر جھکا کر کمرے میں واپس آ گیا۔ یہ کوئی

تھا۔ اتنا اچھا بچہ آخر اتنا گستاخ کیوں کر ہو گیا؟ وہ نماز پڑھتے ہوئے گڑگڑا کر اس کے لیے دُعائیں مانگتیں، لیکن کامران کے رویے میں ذرا فرق نہ آیا۔ بلکہ اب تو وہ ذرا ذرا سی بات پر یوں مشتعل ہو جاتا اور ایسے گرج کر بات کرتا کہ امی جان کا دل کانپ اٹھتا۔

''کامران! ماں کے آگے اتنی گستاخی نہ کرو کہ کبھی تمہیں پچھتاوے کی آگ میں جلنا پڑے۔''

وہ درد بھرے لہجے میں بس اتنا ہی کہتیں اور غم ناک آنکھوں سے اپنے کمرے میں چلی جاتیں۔

اس دن تو حد ہی ہو گئی۔ محلے کی ایک خاتون انہیں ملنے آئیں۔ امی جان نے چپکے سے کامران سے کہا کہ بازار سے جا کر ان کے لیے کھانے پینے کا کچھ سامان لے آؤ، مگر کامران نے ٹکا سا جواب دیا۔ گھر میں کوئی اور تھا نہیں۔ امی جان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مہمان نوازی کی اہمیت بتائی، مگر کامران ٹس سے مس نہ ہوا۔ گرمی کا موسم تھا ناچار امی چپکے سے خود ہی چلچلاتی دھوپ میں بازار سے کھانے پینے کی اشیاء لینے چل دیں۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی خاتون کو چند رسالے دے گئیں کہ آپ یہ دیکھیں میں ابھی آتی ہوں۔

اس طرح کے کئی واقعات تھے کہ کامران وہ پہلے والا کامران لگتا ہی نہیں تھا۔ امی جان نے ابا جان سے اس رویے کی شکایت کرنا مناسب نہ سمجھا نہ ہی فیضان کو فون کرتے وقت کبھی اس کی بدتمیزیوں کا بتایا۔

''اے دلوں کو بدلنے والے رب! میرے کامران کا دل بھی بدل دے، اس میں وہی پہلے سی محبت ڈال دے۔'' دُعا مانگتے ہوئے ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتیں۔ اس کا رویہ وقت کے ساتھ ساتھ امی جان سے بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ دُوسروں کے ساتھ وہ پہلے جیسا کامران ہی تھا۔ ویسا ہی بااخلاق، مودب، شائستہ،

لیکن امی جان سے اس کا رویہ ناقابلِ برداشت تھا۔ ابھی کل کی بات ہے امی جان اتنے پیار سے اُسے جگانے گئیں: ''کامران بیٹا کیا آج سکول نہیں جانا؟''

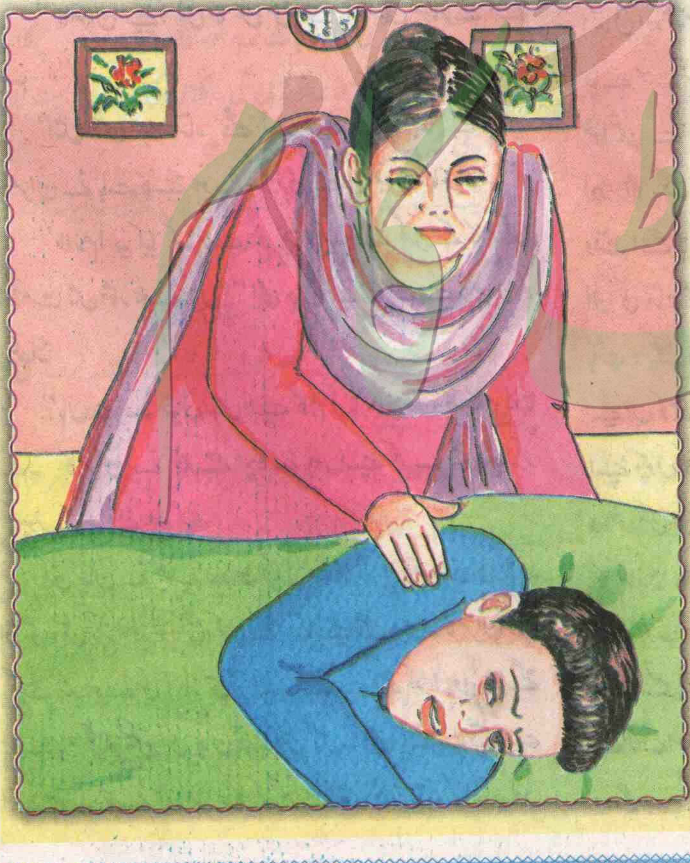
''ہٹ جائیں یہاں سے۔'' اس نے کروٹ بدل کر رخ دُوسری طرف کر لیا۔

''مگر بیٹے! دیر ہو جائے گی اٹھو نا'' انہوں نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''ہٹ جائیں! چلی جائیں میرے کمرے سے مجھے نفرت ہے آپ کی شکل سے، چڑیل لگتی ہیں آپ مجھے۔'' کامران غصے سے پاگل ہونے لگا۔ امی جان تو پریشان ہو گئیں۔

''کامران بیٹا! کیا ہوا کوئی خواب دیکھا ہے کیا؟'' کامران خاموش ہی رہا۔ آخر امی جان نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور پریشانی سے باورچی خانے کی طرف چل دیں۔

ناشتے میں تمام چیزیں کامران کی پسند کی تھیں۔ کامران نے حیرت سے ایک نظر امی جان کو دیکھا مگر بولا کچھ نہیں اور مزے



مزے سے سارا کچھ چٹ کر گیا۔ کامران تو خوشی خوشی سکول چل دیا، مگر امی جان کا سکون چین بھی ساتھ لے گیا۔ اس دن منور صاحب کے آفس جانے کے بعد انہوں نے کامران کے لیے صلوٰۃ حاجت پڑھی اور سجدے میں خوب روئیں۔

''میرے اللہ میں تو ان بچوں کو صدقہ جاریہ بنانا چاہتی ہوں اور کامران کیا کر رہا ہے؟ میرے مالک! ہمارے تمام گناہ معاف کر دے، ہمیں بخش دے اور ہم سے راضی ہو جا۔'' وہ بڑی دیر تک سجدے میں دُعا کرتی رہیں۔

پھر حسبِ عادت کامران کی پسند کا کھانا پکایا۔ آلو کی چپس بھی بنائی جو اُسے بہت پسند تھی۔ جب کامران سکول سے لوٹا تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتمار رہا تھا۔ وہ آتے ہی امی جان کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولا۔

''امی جان! مبارک ہو آپ کا بیٹا تقریری مقابلے میں اول انعام لے کر آیا ہے۔ امی جان سب کچھ بھول کر اس کا ماتھا چومنے لگیں:

''سچ مچ کامران! مجھے بتایا کیوں نہیں میں خود تمہیں تقریر لکھ کر دیتی، تقریر کا کیا عنوان تھا؟''

امی جان نے خوشی سے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

تقریر کا عنوان تھا ''ماں تو ہر حال میں بچوں کو دُعا دیتی ہے۔''

''اس موضوع پر تمہیں کیسے اول انعام مل گیا بیٹے؟ تم تو آج کل ماں کے دشمن بنے ہوئے ہو۔'' امی جان کا دل ٹوٹ سا گیا۔ صبح والا واقعہ پھر ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

''امی جان...... میری پیاری امی جان! اسی لیے تو انعام ملا ہے دُوسرے لڑکوں نے رٹی رٹائی تقریریں کیں، کتابی فقرے بولے، آپ کے بیٹے نے اپنے ذاتی تجربات بتائے اور میدان مار لیا۔''

کامران آج بڑے دنوں بعد وہی پہلے جیسا کامران لگ رہا تھا۔ امی جان دل ہی دل میں دُعا کر رہی تھیں کہ یا اللہ دلوں کو بدلنے والے میرے رب! میرے بچے پر رحم کر اسے فرماں برداری کے راستے پر لے آ۔

''امی جان! مجھے معاف کر دیں۔''

کامران ان سے پیار سے لپٹ کر بولا:

''امی جان! مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو بہت ستایا ہے۔

''چلو شکر ہے کہ احساس تو ہوا تمہیں۔'' امی جان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''احساس...... یوں نہ کہیں امی جان! آپ کیا جانیں میں کس قدر پریشان رہتا تھا۔''

''پریشان رہتے تھے'' امی جان نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''بیٹا! اگر آپ پریشان رہتے تھے تو پھر ایسا کیوں کرتے تھے؟''

''امی جان! تقریر کے لیے۔''

''تقریر کے لیے۔'' امی جان اب بھی کچھ نہ سمجھی تھیں۔

''اوہ...... میری بھولی امی جان! میری پیاری امی جان! میں اپنی تقریر میں اپنے ذاتی تجربات شامل کرنا چاہتا تھا۔''

''اوہ...... تو تم سچ مچ ایسے گستاخ نہ تھے؟'' امی جان نے مسرت آمیز حیرت سے پوچھا۔ ان کے دل سے جیسے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا تھا۔

''ہرگز نہیں...... قطعاً نہیں۔ بھلا ماں سے گستاخی کر کے میں اپنی دُنیا اور آخرت برباد کر سکتا ہوں، ایسا کبھی سوچیں بھی نا امی جان! آپ تو میری جنت ہیں۔'' کامران نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سر جھکا کر کچھ اس انداز سے کہا کہ امی جان بے اختیار مسکرا دیں۔

انہوں نے غم ناک آنکھوں سے کامران کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ کافی دیر کامران کو اپنے ساتھ لپٹائے کھڑی رہیں۔ دل ہی دل میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرتی رہیں۔ پھر بولیں: ''دیکھو بیٹا! تقریریں خوب کرو، پھلو پھولو، مگر ایسے ذاتی تجربات دوبارہ نہ کرنا۔''

''امی جان میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا، آپ یقین کریں مجھے بھی یہ اداکاری کرنا کچھ آسان نہیں لگا۔ آپ کیا جانیں یہ سب کچھ کر کے میں خود بہت پریشان ہو جایا کرتا تھا۔''

''اور جو مجھے اتنا زیادہ پریشان کیا کرتے تھے۔''

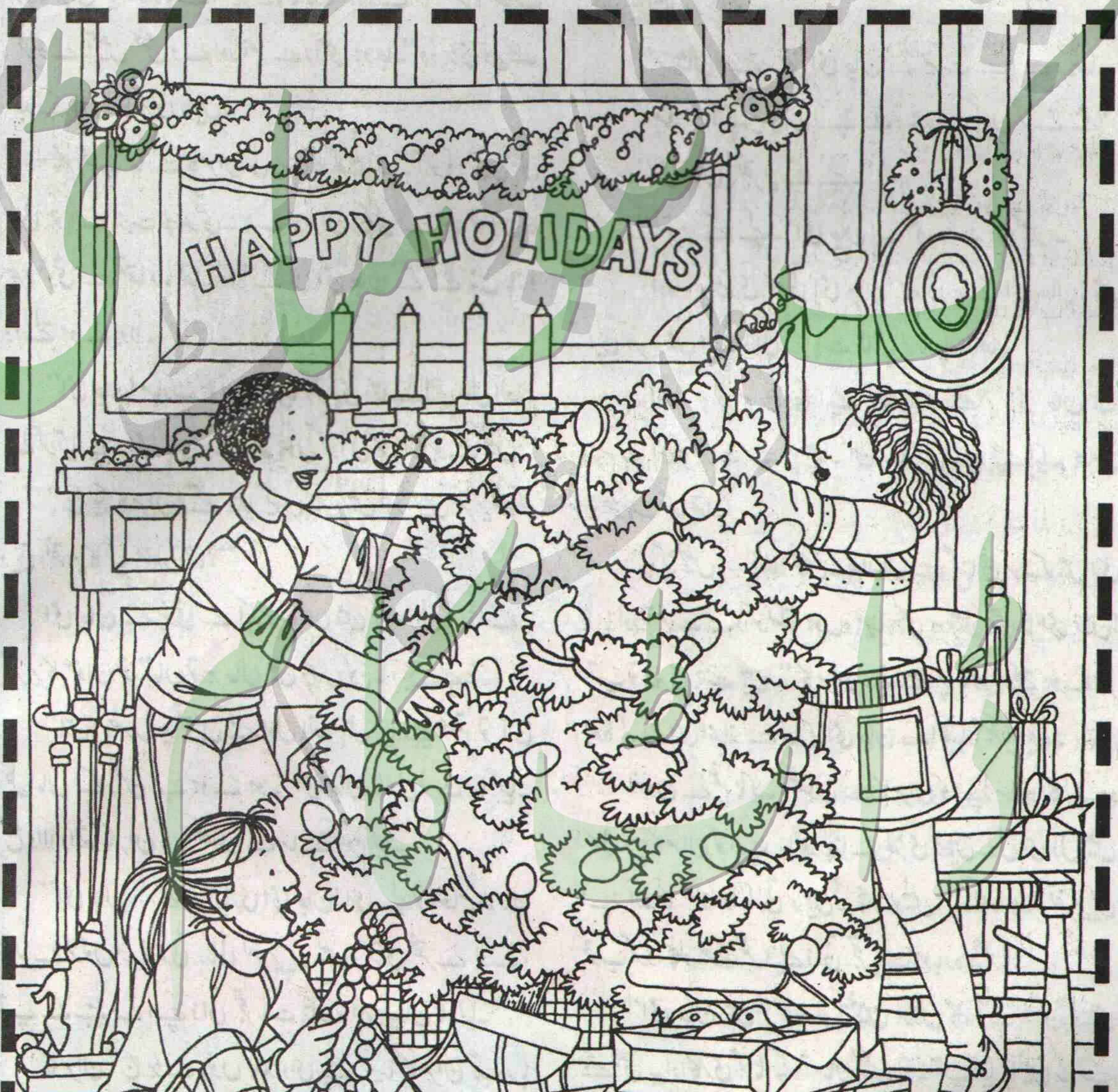
امی جان نے بناوٹی غصے سے کامران کو دیکھا پھر دونوں مسکرانے لگے۔

اوجھل خاکے

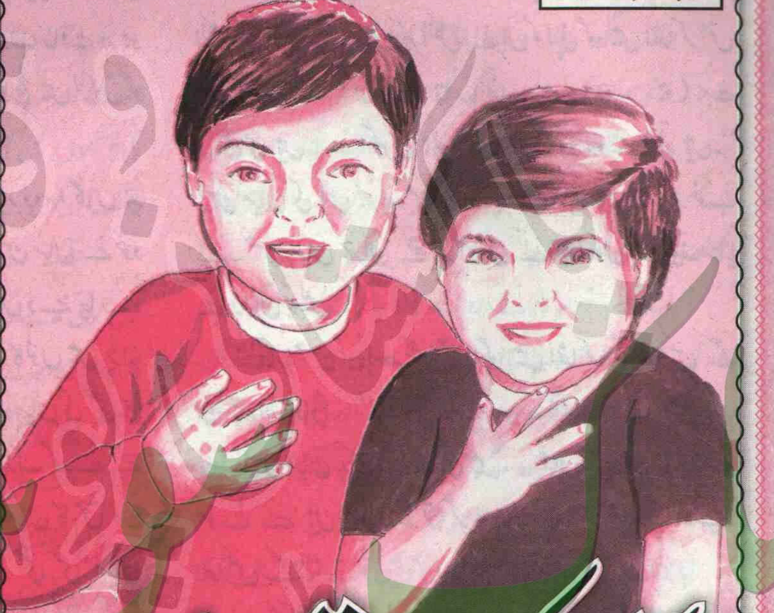




یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔



مجیب ظفر انوار حمیدی



ابا! پاکستان تو میرا ہے

ننھے منے دو سالہ سعد میاں کمرے میں داخل ہوئے اور اپنی ننھی ننھی پھولتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولے:

"اماں...... باہر...... گٹر...... مم...... باار (باہر) گٹر...... مم اماں با ار گٹر مم...... اماں باار گٹر مم...... ابا...... بار ار گٹر مم...... اوں......"

اتنا کہہ کر سعد میاں نے اپنی ننھی سی ناک سکوڑی کیوں کہ گھر سے باہر سڑک پر بہنے والے گندے پانی کی بو کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

ابا کچھ دیر پہلے نماز ادا کر کے مسجد سے گھر آئے تھے، باہر سڑک پر ایک گٹر ابل گیا اور متعلقہ ادارے کے اعلیٰ حکام کی بارہا توجہ دلانے کے باوجود اس کام کو پسِ پشت ڈالنے کی قومی عادت پر عمل کیا جا رہا تھا۔ آج سعد میاں کا یہ انداز دیکھ کر ابا خوشی سے نہال ہو گئے اور کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے خوش بو چھڑکی (یعنی روم فریشر کیا) اور پھر اپنے دو سالہ پوتے کو گود میں اٹھا کر خوب پیار کیا جسے ٹھیک طرح سے بولنا بھی نہیں آیا تھا، لیکن پھر وہ معصوم پھول گھر والوں کی اعلیٰ و بہترین تربیت کے باعث اس کم سنی میں بھی خوش بو دینے لگا تھا۔ ابا نے سعد میاں کو گود میں لے کر پیار کیا۔ سعد میاں کی ننھی ننھی آنکھوں میں ابا کی ڈاڑھی کے بال چبھے تو جھٹ ننھی مٹھیوں کو آنکھوں پر رگڑنا شروع کیا۔

اب تو ابا خوب ہنسے...... "ٹھاہ...... ٹھاہ...... ٹھاہ!!!"

گرمی خوب پڑ رہی تھی اور حبس کا عالم تھا، سکولوں میں موسمِ گرما کی تعطیلات تھیں، حسن میاں شربت کا دُوسرا گلاس بلی مانو کو پلا کر آ رہے تھے، وہ شربت لے کر جاتے تو مانو کے نام پر تھے کہ ماما نے بہت اچھا شربت بنایا ہے اور مانو آج تھری (تین) گلاس پیئے گی اور خوب موٹی تازی ہو جائے گی اور پھر گندے چوہے کھانا چھوڑ دے گی، لیکن حسن دراصل شربت وہ مانو کے سامنے رکھ کر خود پی رہے تھے کیوں کہ مانو بیگم تو شربت کا گلاس دیکھتے ہی منہ موڑ لیتیں اور حسن میاں کہتے:

"مانو پی لو، پی لو...... ہم بھی تو ابا کے کہنے سے دودھ پی لیتے ہیں حالانکہ وہ ذرا بھی نہیں اچھا لگتا...... ابا سے ڈر لگتا ہے کیوں کہ وہ بابا کے بھی بابا ہیں......"

مانو بلی کو حسن میاں کی پوری بات میں صرف "دودھ" والا وہ لفظ اچھا لگتا اور وہ نہایت سریلی آواز میں "میاؤں!!!" کہتیں، لیکن چھ سالہ حسن میاں کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ مانو صاحبہ شربت کی بجائے دودھ کا تقاضا فرما رہی ہیں...... وہ سمجھے کہ جس طرح دودھ انہیں پسند نہیں اسی طرح مانو کو بھی کہاں پسند ہو گا......

جب مانو کی میاؤں میاؤں حد سے تجاوز کرنے لگی تو کمرے سے اماں کی آواز آئی کہ حسن یہ شربت نہیں پیئے گی...... دودھ لاتی ہوں...... یہ شربت تم پی لو...... طاقت ور بن جاؤ گے۔

اب تو حسن میاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا کہ وہ

طاقت ور بن جائیں گے اور جلدی سے بڑے ہو جائیں گے، دو ہی تو خواب تھے ان کے، ننھے ننھے معصوم خواب کہ خوب طاقت ور ہو جائیں اور جلدی سے بڑے ہو کر ابا کی طرح کالج میں لڑکوں کو پڑھائیں۔

جب مانو محترمہ ٹس سے مس نہ ہوئیں تو ناچار دُوسرا گلاس جو گلابی پھولوں والا خوب صورت گلاس تھا، وہ بھی حسن میاں نے خود پی لیا اور خالی گلاس لے کر ماما کو باورچی خانے میں دینے جا رہے تھے کہ یکایک ابا کا گولیوں کی طرح فائر کرتا قہقہہ کانوں میں پڑا۔ وہ فوراً رک گئے اور کمرے کا منظر دیکھ کر تو حسن نوید میاں کی ننھی سی جلن اور معصومانہ حسد اپنی انتہا پر پہنچ گئی کہ نرم و نازک گورے چٹے سعد کو ابا پیار کر رہے تھے...... یہ تو سراسر حسن میاں کا حق دن دہاڑے لوٹا جا رہا تھا...... وہ فوراً آگے بڑھے اور ننھی ننھی مٹھیاں بھینچ کر بولے:

''ابا! آپ نے سعد کو گود میں کیوں لیا ہے؟''

''کیوں کیا یہ میرا پوتا نہیں ہے، اس کی تربیت میرا فرض ہے، تم سے چار سال چھوٹا ہے اور تمہارا چھوٹا بھائی ہے حسن میاں!''

ابا بولے۔

حسن میاں بھی ابا ہی کے پوتے تھے، تڑ سے بولے: ''وہ تو ٹھیک ہے ابا، لیکن سعد کچھ اتنا خاص اچھا تو نہیں لگ رہا ابھی...... اس سے اچھا سوٹ تو یو...... یو (جو...... جو) آپ مجھے لائے تھے بہت مہنگا والا ابا...... وہ میں پہنے ہوئے ہوں اور میں سعد سے زیادہ اچھا لگ رہا ہوں!''

''اوہو...... اب میں سمجھا کہ آپ بھی گود میں آنا چاہ رہے ہیں، کیسا پکڑا......'' ابا نے کہا ہی تھا کہ حسن میاں نے زور زور سے اچھلنا شروع کر دیا حالانکہ ان کی چوری پکڑی گئی تھی۔

''جی نہیں...... جی نہیں...... میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا ابا!'' وہ اچھلتے جاتے اور کہتے جاتے۔

ابا نے سعد میاں کو نیچے اتار کر محمد حسن نوید میاں کو اپنی گود میں لے لیا: ''میرا ولی عہد تو بڑا ہو رہا ہے ماشاء اللہ اب...... اب اسے گود میں لیتے ہوئے شرم آتی ہے......'' ابا نے کہا۔

''جی نہیں...... جی نہیں...... ابا آپ کو تو پتا ہی نہیں ہے کہ اکبر کے ماموں حض (حج) کرنے گئے تو نانی جان بھی گئی تھیں یعنی اکبر انکل کی ماما...... تو...... تو اکبر انکل نے ان کو اپنی گود میں اٹھا کر حض (حج) کرایا تھا...... اکبر مجھے بتا رہا تھا...... یو یو (جو...... جو) بہت بوڑھی سی ہیں نا...... اکبر کی نانو (نانی جان) وہ گود میں آتی ہیں۔''

حسن میاں کی اس بھرپور معلومات پر اماں، ابا، ماما اور سعد خوب ہنسے۔ حسن میاں حیران تھے کہ انہوں نے ایسا کون سا لطیفہ سنایا ہے۔ اماں بولیں:

''ہمارا حسن اور سعد بھی ہمیں گود میں اٹھا کر حج کرائیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ......''

حسن میاں بدک گئے: ''جی نہیں...... اماں آپ اور ابا تو بہت موٹے سے ہیں، اور سعد تو گر پڑیں گے...... ہم آپ کو کیسے اٹھائیں گے؟''

اماں مسکرائیں اور بولیں: ''جوان جہان ہو جائیں گے ان شاء اللہ میرے دونوں گلاب...... خوب مہکیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ، اپنے علم اور بہترین عمل کی خوش بو خوب بکھیریں گے دونوں!''

ابا بولے: ''آمین!''

اچانک حسن میاں چونکے اور ابا سے پوچھا کہ انہوں نے کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں کیوں بند کی ہیں۔ اس پر سعد نے پورے جوش و خروش سے بتایا: ''بھائی...... باہر گٹر مم!''

اب تو حسن میاں کو خوب غصہ آیا، ابا سے بولے: ''ابا آپ اپنے کالج والا ڈنڈا نکال کر اس لڑکے کی پٹائی لگائیں جس نے ہماری روڈ (سڑک) پر گندا پانی ڈال دیا ہے اور گٹر بھی صاف نہیں کرتا۔ ابا مس افشاں اسلامیات کے پیریڈ میں بتا رہی تھیں کہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو صفائی نہایت پسند تھی اور آپ ﷺ جمعہ کے علاوہ بھی خوش بو اپنے کپڑوں پر لگاتے تھے...... روز صاف ستھرے دھلے ہوئے کپڑے بھی پہنتے تھے۔ ابا یہ گٹر صاف کرنے والے کون ہوتے ہیں؟''

حسن میاں کے معصوم پریشان چہرے پر کئی سوالات تھے۔ ابا مسکرانے لگے۔ اچانک حسن میاں چونکے اور ''سوں...... سوں......'' کر کے اپنی ناک کو پھلانے اور پچکانے لگے، اچانک کچھ سونگھ کر بولے: ''ابا...... یہ اتنی گندی (بد) بو کہاں سے آ رہی ہے؟''

ابا مسکرا کر بولے: ”ہمارے گھر سے!“

”ہمارے گھر سے! وہ کیسے ابا؟“ حسن میاں حیران رہ گئے۔

”منے میاں...... ہمارے گھر کی باہر والی سڑک پر گٹر کا پانی بہہ رہا ہے اور صفائی کرنے والے بار بار بلانے کے باوجود نہیں آئے، اب کیا کیا جا سکتا ہے سوائے صبر کے۔ دروازہ اور کھڑکیاں کھولو گے تو بدبُو اور بڑھ جائے گی!“

”ہائے میرا تو سر مارے درد کے پھٹا جا رہا ہے، اتنی گندی بُو سے اور جراثیم جو اڑ رہے ہیں اس گندے پانی کی وجہ سے، ان سے بچے اور بڑے الگ بیمار ہو جائیں گے اور طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جائیں گے...... اللہ یہ ملازم کتنے کام چور اور لاپروا ہوتے ہیں۔“ اماں نے اپنا سر پکڑ کر کہا۔

ابا بولے: ”اس کے علاوہ نمازیوں کو بھی آتے جاتے اس قدر تکلیف ہو رہی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیے!“

سعد بولے: ”بھائی...... باأر...... گٹر...... مم!“ (یعنی بھائی باہر گٹر کا پانی بہہ رہا ہے)

حسن میاں نے سعد کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ”چلو سعد...... ہم اپنے گھر کے سامنے والی سڑک کو صاف کر کے آتے ہیں تاکہ بابا کو، ابا کو اور دُوسرے انکل، آنٹی اور بچوں کو تکلیف نہ ہو!“

”کیوں میاں...... تم کیوں صاف کرو گے سڑک پر بہتا گندا پانی؟“ اماں نے ماتھے پر تیوریاں ڈال کر پوچھا۔

ابا بڑی دل چسپی کے ساتھ یہ مکالمہ سن رہے تھے، اچانک حسن بولے: ”نہیں اماں...... ہمارا گھر یو...... یو (جو...... جو) پاکستان میں ہے تو تب ہمارا گھر گندا ہو گا...... اس کے سامنے گندا پانی بہے گا تو پاکستان بھی تو گندا ہو جائے گا نا، اسی لیے میں اور سعد اپنے پیارے وطن پاکستان کو صاف رکھیں گے...... ورنہ سارے بچے بیمار ہو جائیں گے۔ جیسا آج صفائی کے پیریڈ میں مس غزالہ بتا رہی تھیں...... یو...... یو (جو...... جو) پنک (گلابی) رنگ کا اسکارف پہنتی ہیں نا...... وہ والی مس غزالہ!“

جذبات کی شدت سے حسن میاں کا معصوم چہرہ لال ہو رہا تھا اور وہ اپنے ننھے سے ہاتھ میں سعد میاں کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے پیارے پاکستان کی حفاظت کرنے اور اسے صاف ستھرا کرنے جا رہے تھے۔

اچانک ابا اپنے لائق، فائق پوتوں کے سامنے فرش پر اکڑوں بیٹھ گئے اور اپنے دونوں ہاتھوں میں چار ننھے منے ہاتھ تھام لیے، ابا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ یکا یک رونے لگے اور اماں سے مخاطب ہو کر بولے:

”بیگم...... اللہ گواہ ہے کہ جب تک پاکستان کی حفاظت نئی نسل کرتی رہے گی تو خدا کی قسم پاکستان کو قیامت تک کچھ نہیں ہو گا...... اے میرے رب تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے ہی اس ملک کو قائم کیا اور ہر آنے والی نئی نسل کے ننھے منے معصوم دلوں میں تو ہی اس خستہ حال اور پریشان وطن کی محبت منتقل کر دیتا ہے جو تیرے پاکستان کے معمار ثابت ہوتے ہیں...... واہ میرے رب تیرے بھید تو ہی جانے......!“

اتنا کہہ کر ابا نے اپنے معصوم پوتوں کے ہاتھ چومے، روشن آنکھیں، چمکتی پیشانیاں چومیں اور اللہ تعالیٰ کے آگے سربسجود ہونے کی غرض سے مغرب کی نماز کے لیے اٹھ گئے۔

وہ کمرے سے بار نکلنے ہی والے تھے کہ سعد اور حسن ایک ساتھ بولے: ”ابا...... پاکستان تو میرا ہے......“ سعد میاں تو بہت کم بولتے ہیں اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ کی مدد سے بات کرتے ہیں، اچانک ہنسے ”کھی...... کھی!“ حسن میاں ہنسے ”ہی...... ہی...... ہی“، اماں ان دونوں کو دیکھ کر ہنسیں ”ہاہاہاہا!“ اب سب لوگ ہی ہنس چکے تھے تو ابا کی باری تھی، ابا واپس مڑے اور اپنے دونوں پوتوں کو گود میں اٹھا کر زور سے ہنسے: ”ٹھاہ...... ٹھاہ...... ٹھاہ!!!!!“

ہاہاہا...... ہاہاہا!“ کمرہ قہقہوں سے بھر گیا۔ میرے بچو دُعا کرو کہ اسی طرح ہمارا پیارا پاکستان بھی قہقہوں سے بھرا پُرا رہے یہاں کوئی غم، آفت، پریشانی اور ناگہانی نہ ہو...... سب خوش رہیں...... یہاں کے بچے ہنستے مسکراتے رہیں اور انہیں دیکھ دیکھ کر ان کے بڑوں کے دل مطمئن اور پُرسکون رہیں...... میرے عزیزو...... پاکستان تو ہمیشہ قائم رہنے کے لیے بنا ہے، اسے دشمن کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا کیوں کہ اس کی حفاظت کا ذمہ تو اللہ رب العزت نے خود لیا ہے، کیا سمجھے؟؟؟



فیصلہ

سارہ شیخ

میرا نام ارحم جمیل ہے۔ میں ایک بینک میں کلرک ہوں، حالانکہ میں کامرس میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کر چکا ہوں۔ ایک کلرک کی تنخواہ تو آپ جانتے ہی ہیں کیا ہوتی ہے، اور جب کہ مجھے اپنی ماں، ایک بھائی اور دو بہنوں کی کفالت بھی اکیلے ہی کرنی ہوتی ہے، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے گھر میں تنگ دستی کا دور دورہ رہتا ہے۔ ان پریشانیوں کے باوجود بھی اپنے ایک شوق کی تکمیل بڑے زور وشور سے کرتا ہوں اور وہ ہے...... کہانیاں لکھنا۔ میں بچوں، بڑوں کی کہانیاں لکھ کر مختلف رسالوں میں چھپواتا ہوں اور ہر مہینے گھر لا کر بڑے شوق سے سب کو پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی میری تصویر بھی چھپتی ہے تو میرے بہن بھائی ہفتوں سکول میں اور امی محلے میں ذکر کرتی رہتی ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں ہم سب تھوڑی دیر کے لیے اپنی پریشانیاں بھول جاتے ہیں۔

وہ دن میرے لیے بڑا خاص تھا۔ میں اپنا پہلا ناول کسی ناشر کے پاس چھپوانے کے لیے لے جا رہا تھا۔ اس ناول پر میں نے بڑی محنت کی تھی اور مجھے یقین تھا کہ کوئی بھی ناشر اسے پڑھتے ہی فوراً چھاپنے کی حامی بھر لے گا۔ میں نے اُس روز خاص اسی کام کے لیے چھٹی کی تھی، کیوں کہ میں اپنا ناول جلد سے جلد چھپوانے کا خواہش مند تھا۔

میں این آر پبلشرز کے دفتر میں داخل ہوا۔ میں نے استقبالیہ پر بیٹھے آدمی کو اپنے آنے کا مقصد بتایا تو اُس نے مجھے انتظار کرنے کو کہا اور فون پر کچھ بات کرنے لگا۔

تقریباً دو گھنٹے کے انتظار کے بعد اُس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا تو میں کمرے میں داخل ہوا۔

”یہ ناول چھپوانے کے لیے لایا ہوں۔“ میں نے اپنا پیکٹ اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

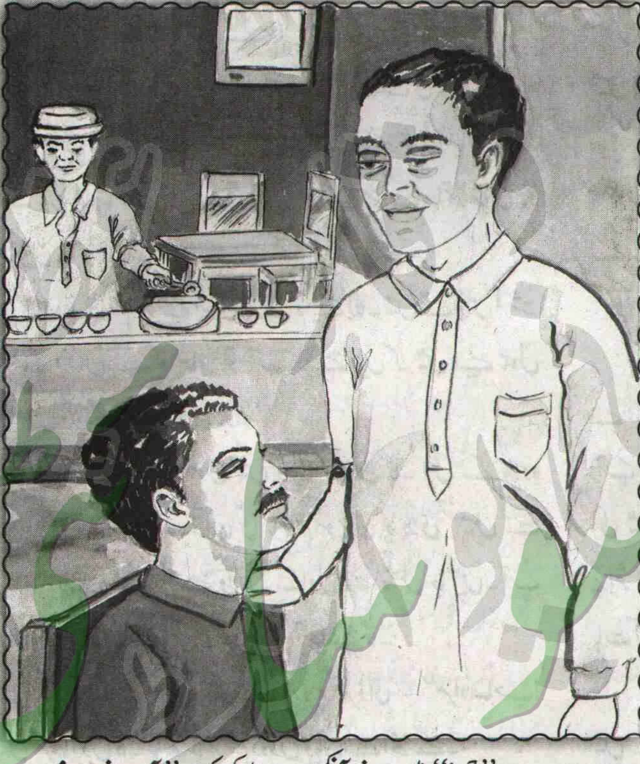
”پچاس ہزار ایڈوانس دے سکتے ہیں آپ؟“ این آر نے کہا۔

”پچاس ہزار روپے! وہ کس لیے؟“ مَیں نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”دیکھیں جناب یہ کتاب چھپوانے کا اصول ہے کہ ضمانت کے طور پر مصنف کو بھی کچھ پیسے دینے ہوتے ہیں۔ کتاب چھپنے کے بعد ہم دیکھیں گے کہ اِس کی مقبولیت کا گراف کتنا ہے۔ اُس حساب سے آپ کو منافع دیا جائے گا۔“

یہ باتیں سن کر میں مایوسی کے عالم میں وہاں سے چلا آیا۔

دفتر سے باہر نکل کر میں سامنے بنے ایک ڈھابے پر چلا گیا اور چائے کا آرڈر دیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے ناول کو پھاڑ کر پھینک دوں! کیا فائدہ ہے اتنی محنت کرنے کا۔ غریب آدمی کو آگے



بڑھنے کا حق ہی نہیں ہے جیسے! بس جس کے پاس پیسہ ہے وہ سب سے آگے ہے...... میں یہی سب سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو میرے سامنے ایک خوش لباس اور ہنس مکھ شخص کھڑا تھا۔

”کیا میں آپ کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟ اور کوئی میز خالی نہیں ہے۔“ میں نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا: ”جی جی بالکل کیوں نہیں؟“

پھر وہ میرے سامنے بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا: ”آپ کو میرے یہاں بیٹھنے سے کوفت تو ہو ہی رہی ہوگی مگر عقل مندوں کا قول ہے کہ اپنے منفی خیالات کو خود تک محدود رکھنا جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہوتا۔“ میں نے چونک کر اس کے مسکراتے چہرے پر نظر ڈالی۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں کچھ منفی بات سوچ رہا ہوں۔“

”بات دراصل یہ ہے کہ میں نے آپ کو این آر پبلشرز کے دفتر سے افسردہ حالت میں نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بُرا نہ مانیے گا، مگر وہ ناشر صاحب لباس سے آدمی کی مالی حالت کا اندازہ لگانے کے لیے مشہور ہیں۔“

اُس نے میرے کئی بار کے دُھلے ہوئے پرانے سوٹ پر نگاہ ڈالتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ میں نے کچھ کہے بغیر سر جھکا لیا۔ اتنے میں بیرا چائے لے آیا۔

”آپ پریشان نہ ہوں پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ شائد میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔“

”آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں، کیا آپ بھی کہانیاں لکھتے ہیں؟“

”جی نہیں، لکھنا تو کسی کسی کا کام ہے۔ میں تو لکھا ہوا چھاپتا ہوں۔“

”تو پھر آپ کتنے پیسے مجھ سے لینا چاہیں گے؟“

”ایک پیسہ بھی نہیں!“ اُس نے گویا دھاکہ کر دیا۔

”جی!“ میں نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”آپ ضرور مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔“ اُس نے میری حیرت سے گویا محظوظ ہوتے ہوئے کہا:

”میں ایسا کیوں کر رہا ہوں، اس کی وجہ بھی میں آپ کو بتاتا ہوں۔“ اُس نے چائے کی ایک چسکی لے کر کہا، ”بات یہ ہے کہ مجھے ایسا لگنے لگا ہے کہ جیسے لوگوں میں انسانیت کا درد اور دُوسروں کا خیال رکھنے کے جذبات میں کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔ میں اپنے وطن کے لوگوں میں نرم دلی اور رقت کے جذبات پھر سے اُجاگر کرنا چاہتا ہوں تاکہ لوگ دوبارہ ایک دُوسرے کا احساس کر سکیں۔ اِسی مقصد کے لیے میں اپنے ادارے سے ایسی کہانیاں چھاپنا چاہتا ہوں جو حد درجہ رقت انگیز ہوں۔ ایسی تحاریر جن کا انجام دردناک ہو۔ ایسی چیزیں جب لوگ پڑھیں گے تو کہانی میں موجود کرداروں کے جذبات و خیالات اُن پر بھی اثر انداز ہوں گے اور اُن کے دلوں میں بھی رقت پیدا ہوگی۔ لوگوں کے دلوں کو نرم کرنے کا یہ ایک انتہائی مؤثر ذریعہ ہے، آپ سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ جان دار تحریریں قاری کے ذہن پر کتنا اثر کرتی ہیں۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکا۔ میں حیرت میں گم اُس کی باتیں سن رہا تھا، اُس

کے خاموش ہو جانے پر میں نے سوال کیا۔

"تو پھر آپ نے اِس سلسلے میں کچھ پیش رفت کی؟"

"جی ہاں میں نے چند مصنفین کو اپنے ساتھ شامل کیا ہے، اور اب میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس سفر میں میرے ساتھ شامل ہو جائیں۔"

وہ بات ختم کر کے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اُس فرشتہ صفت انسان سے پوچھا، "تو آپ چاہتے ہیں کہ میں ایسے ناول لکھوں جن کا انجام ناکامی ہو؟"

"جی ہاں، مگر موضوع میں آپ کو دوں گا۔ اس کے علاوہ کرداروں کے جذبات، اُن کی ناکام سوچوں کو بڑی تفصیل سے بیان کرنا ہوگا تاکہ پڑھنے والوں کے دل فوراً پگھل جائیں۔ آپ میرا کارڈ رکھ لیجیے اور کل میرے دفتر آ جائیے گا۔"

"بہت بہت شکریہ۔" میں نے کارڈ پر نظر ڈالی...... "مراد صاحب! میں ضرور آؤں گا۔" ہاتھ ملا کر ہم دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔

دُوسرے دن میں مراد کے دفتر میں داخل ہوا تو اُس نے بڑی گرم جوشی سے مجھے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔ اُس نے اپنی دراز میں سے کچھ نوٹ نکال کر مجھے دیئے تو میں چونک سا گیا۔ "چونکہ میں اپنی شرائط پر آپ سے ناول لکھوا رہا ہوں، لہٰذا یہ دس ہزار روپے رکھ لیجیے، ناول مکمل کرنے کے بعد بقیہ بیس ہزار روپے آپ کو مل جائیں گے اور پھر ہر دفعہ ناول چھپنے پر جو منافع ہوگا، اُس کا بیس فیصد آپ کو ملے گا۔ کہیے آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

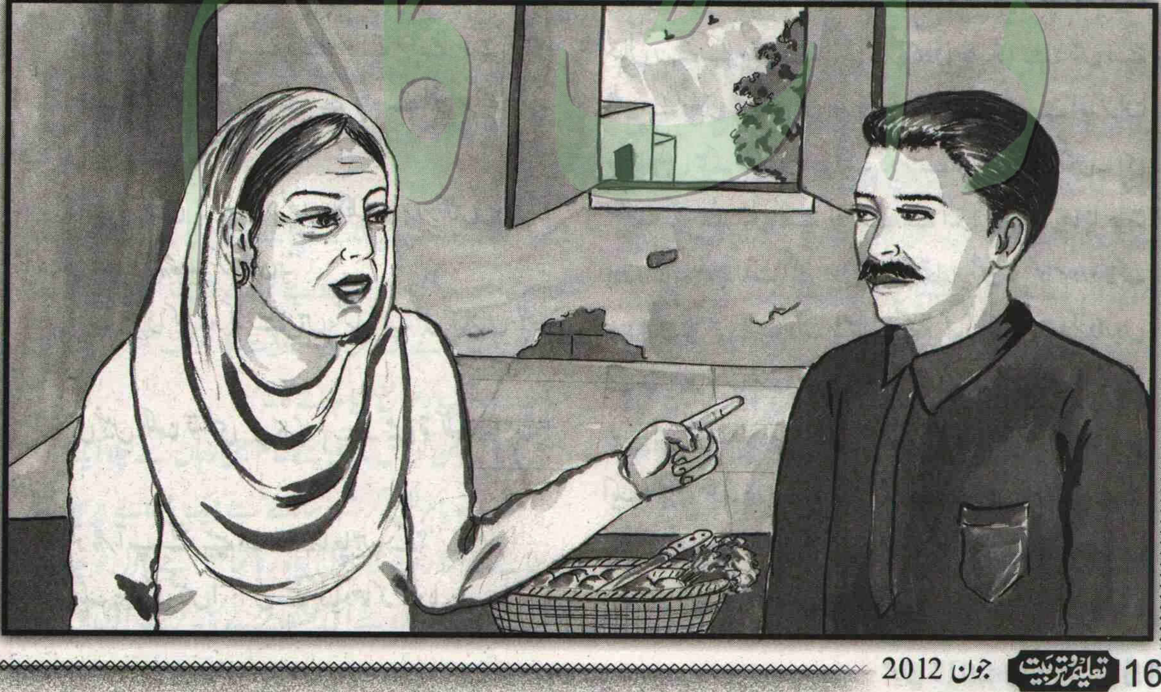
میں تو حیرت، خوشی اور شکرگزاری کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہوا جا رہا تھا۔ میں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے پیسے لے لیے اور اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے ایسے ہاتھ ہلایا جیسے یہ کوئی بات نہیں ہے۔ معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد وہ کہنے لگا:

"اب میں آپ کو ناول کا موضوع بتاتا ہوں۔ موضوع ہے...... بے روزگاری کی وجہ سے بیزاری اور پھر خودکشی۔ بیچ میں آپ اپنی مرضی سے کچھ بھی واقعات شامل کر سکتے ہیں۔ ایک بات کی میں پھر وضاحت کر دوں کہ کرداروں کی اداسی اور تکلیف کو پُراثر انداز میں بیان کیجیے گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"جی جی! میں سمجھ گیا ہوں آپ کو یہ ناول کب تک چاہیے؟" میں نے ادب سے پوچھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔

"ایک مہینے کا وقت ٹھیک ہے؟ ویسے آپ مزید دن بڑھا بھی سکتے ہیں۔ آپ نوکری بھی تو کرتے ہیں نا...... ارے ہاں!" وہ یک دم چونک کر بولا، جیسے کچھ بھول گیا ہو، اور دراز میں سے ایک ڈبہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"یہ ہمارے ادارے کی طرف سے آپ کو دیا جا رہا ہے تاکہ



آپ ہم سے رابطے میں رہیں۔'' ایک قیمتی موبائل فون کا ڈبہ دیکھ کر میں جیسے مراد کے احسانات کے بوجھ تلے دب ہو گیا۔

گھر آ کر میں نے تخت پر بیٹھی سبزی کاٹتی امی کو سلام کیا اور دس ہزار روپے ان کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ وہ حیرت سے مجھے کچھ دیر دیکھتی رہیں، پھر پوچھنے لگیں۔

''اتنے پیسے بیٹا؟ کیا کہیں سے قرض لیا ہے؟''

''ارے نہیں امی! کسی سے قرض نہیں لیا، یہ آپ کے بیٹے کی محنت کا پھل ہے جو اُسے کرنی ہے۔'' میں نے اُن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بتایا۔

وہ مسکرا کر بولیں: ''محنت سے پہلے ہی محنت کا پھل مل گیا؟ کیا کوئی نئی نوکری مل گئی ہے؟''

میں نے انہیں زیادہ دیر تجسس میں نہیں رہنے دیا اور ساری بات انہیں بتا دی۔

میری بات سن کر امی کچھ فکر مند سی ہوگئیں۔ مجھے اچھا نہیں لگا اور میں نے منہ پھلا کر کہا: ''کیا ہوا؟ آپ کو میری ترقی اچھی نہیں لگی؟ اب ہمارے گھر کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ اس بات پر آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟'' امی کھوجتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی بولیں۔

''ارحم، کیا تمہیں مراد کی باتیں صحیح لگی ہیں؟''

''کیا مطلب امی! اس میں غلط کیا ہے؟ آج کل تو کوئی بھی اپنے وطن کی بھلائی کا نہیں سوچ رہا۔ ہر کوئی نفسا نفسی میں لگا ہوا ہے۔ ایسے میں اگر ایک شخص ایک چھوٹا سا کام اپنی قوم کو سدھارنے کے لیے کرنا چاہ رہا ہے تو اس میں غلط کیا ہے؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ امی نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے مجھ سے دُوسرا سوال کیا۔

''اچھا یہ بتاؤ، اگر تمہیں روزانہ گھر آنے پر گھر کے مسائل، بہن بھائیوں کی اُداس شکلیں اور غربت کا رونا روتی ماں نظر آئے تو تمہاری کیا کیفیت ہوگی؟''

میں نے سوچتے ہوئے کہا، ''ظاہر ہے، میں پریشان ہوں گا، اداس ہوں گا۔''

''اور تمہاری ذہنی حالت کیا ہوگی؟ تم کیا محسوس کرو گے؟'' امی نے بدستور اُسی لہجے میں پوچھا۔

''میں دفتر کا کام صحیح نہیں کرسکوں گا، کسی کام کو دل جمی سے نہیں کرسکوں گا۔ مجھے ہر ایک پر غصہ آئے گا، شائد میں چڑچڑا بھی ہو جاؤں گا، مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' میں نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا، تو وہ بولیں۔

''تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں میرے بچے کہ اگر تم مستقل منفی باتیں سن سن کر اور پریشانیوں کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو سکتے ہو تو وہ تمام لوگ جو تمہاری اُداس اور غم زدہ کر دینے والی تحریروں کو مستقل پڑھتے رہیں گے، کیا وہ اپنے ذہن میں منفی سوچیں نہیں پالیں گے؟''

میں نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔ اب اُن کی باتیں میری سمجھ میں آنی شروع ہوگئی تھیں۔

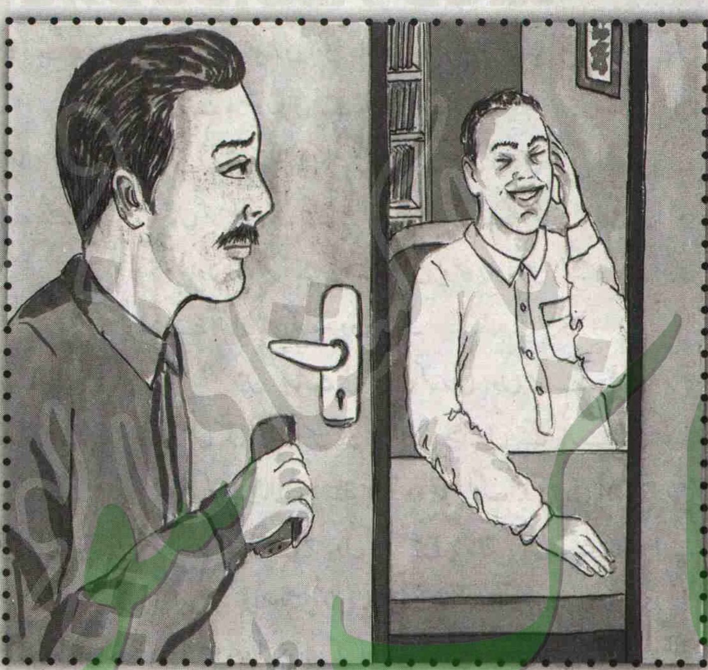
''کسی پتھر پر بھی اگر مستقل پانی کی بوندیں ٹپکاتے رہو تو ایک دن اُس میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے۔ یہ تو انسانی ذہن ہے جس میں تمہارا نیا باس مستقل ناکامیوں اور بربادیوں کی کہانیاں ڈالنا چاہتا ہے۔ تم خود سوچو، جس طرح تم نے کہا کہ تمہیں غصہ آئے گا اور تم چڑچڑے ہو جاؤ گے، اُسی طرح اور لوگ بھی تو مستقل ایسی کہانیاں پڑھ کر چڑچڑے، جھگڑالو اور مایوس ہو سکتے ہیں؟ مراد کا نظریہ غلط ہے۔ تم جا کر اُسے بتاؤ کہ اگر وہ واقعی ملک قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو وطن سے محبت اور اُس کی حفاظت کے موضوعات پر کہانیاں لکھوائے۔

''میں امی جان کی باتیں سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ بات خود میری سمجھ میں پہلے کیوں نہ آئی؟ بہرحال میں نے مراد سے دُوسرے ہی دن ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆......☆......☆

اگلے روز میں دفتر میں پہنچا تو مراد کے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ میں آگے بڑھا تو مجھے دروازے تک پہنچ کر ہی رُکنا پڑا۔ مراد فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

''میں اپنا کام خوب جانتا ہوں۔ اِس ملک سے مجھے تم سے



زیادہ نفرت ہے۔"

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ غیر ارادی طور پر میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکال لیا اور دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مراد کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔

"مجھے افسوس ہے تو صرف یہ ہے کہ میں بھی بندوق اور بم کے ذریعے ان لوگوں کو ختم نہیں کر سکتا، مگر خیر جیسا تم نے کہا، ان لوگوں کو ذہنی طور پر مایوسی کا شکار بنا کر بغاوت اور بدامنی پر تیار کرنا بھی کوئی چھوٹا کام نہیں۔ دو تین بے وقوف لکھنے والے مجھے مل گئے ہیں، اُن سے میں انہی کے پاکستانی بھائیوں کو ذہنی مفلوج بنانے کا کام لوں گا۔ بس دیکھتے جاؤ۔"

یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میں یک دم پلٹا اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح بھاگتا ہوا دفتر سے باہر آ گیا۔ کچھ دُور جا کر میں نے اپنی سانس درست کی اور اُسی وقت مجھے موبائل فون ہاتھ میں ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا تو میری نگاہ اسکرین پر پڑی۔ آواز کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی! میں نے ریکارڈنگ بند کی اور جلدی سے ری پلے، کا بٹن دبایا تو آواز آئی۔ "مجھے افسوس ہے تو صرف یہ کہ......"

مراد کی پوری گفتگو میرے پاس ریکارڈ ہو چکی تھی۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور مجھے اپنی عقل اور اپنے لالچ پر غصہ آ رہا تھا کہ کیوں مجھے پہلے یہ چال سمجھ میں نہیں آئی، کیوں میں چند پیسوں کی خاطر اپنی عقل گنوا بیٹھا اور دوست دشمن میں تمیز نہیں کر سکا؟ وہ تو اگر امی نے مجھے نہ سمجھایا ہوتا تو میں دشمن کے ہاتھوں اُن کا آلہ کار بن چکا تھا۔ بہرحال اب اگر میرے پاس دشمن کے خلاف کوئی ثبوت ہے تو میں اُسے صحیح ہاتھوں میں پہنچانے میں دیر نہیں کروں گا۔ یہ فیصلہ کر کے میں پولیس اسٹیشن کی جانب بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

کرنیں

- خاموشی فضول گفتگو سے بہتر ہے۔
- دل اگر سیاہ ہو تو چمکتی ہوئی آنکھ بھی کچھ نہیں کر سکتی۔
- جاہلوں کی صحبت سے پرہیز کرو ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں بھی اپنے جیسا بنا لیں۔
- ہر روز نیکی کا ایسا کام کرو جو دُوسرے کے چہرے پر تبسم بکھیر دے۔
- اللہ تعالیٰ اگر خوش حالی بخشے تو اپنی خواہشوں کو نہ بڑھاؤ۔
- جھوٹ کا سہارا کبھی مت لو کیوں کہ سچ ہر جھوٹی چیز سے نقاب اُتار پھینکتا ہے۔
- دُوسروں کو عزت دینے سے ہماری عزت کم نہیں ہوتی۔
- وقت تمام زخموں کا مرہم ہے، اُسے موقع تو دیجیے۔
- جو شخص اپنے نفس کا معلم نہیں ہو سکتا دُوسرے کا کس طرح ہو گا۔
- حقیقت کسی اقرار یا انکار کی محتاج نہیں ہوتی۔
- اپنی اقدار کی عزت کرو دُنیا تمہاری عزت کرے گی۔
- ہمیشہ یہی سوچ رکھو کہ میرے رب نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اگر میرے اعمال کے برابر ملتا تو میرے پاس کچھ بھی نہ ہوتا۔

(عائشہ ادریسی، علی پور)



واپسی

سمعیہ غفار

"کاشف بیٹا! تم ٹھیک تو ہو نا، خیریت سے پہنچ گئے، تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی نا؟" کاشف کی امی نے ریسیور کان سے لگاتے ہی پوچھا۔

"امی! میں بالکل ٹھیک ہوں اور خیریت سے یہاں پہنچ گیا ہوں۔ آپ کیسی ہیں امی؟" کاشف نے اپنی خیریت بتانے کے بعد ماں کی خیریت دریافت کی۔

"بیٹا! میں ٹھیک ہوں تم اپنی سناؤ، بہت دنوں بعد فون کیا ہے تم نے۔" ماں نے پوچھا۔

"بس امی نیا ملک ہے، نئی جگہ ہے سیٹ ہونے میں تھوڑا وقت تو لگے گا۔" کاشف نے کہا۔

"بیٹا! تمہیں اپنی منزل تک پہنچنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی۔" ماں نے پوچھا

"نہیں امی کوئی مشکل نہیں ہوئی کیوں کہ جب میں ہوائی اڈے سے باہر نکلا تو وہاں میری ملاقات جیک سے ہوئی۔ جیک یہیں رہتا ہے، اس نے میری بہت مدد کی۔" کاشف نے ماں کو بتایا۔

"بیٹا! جیک اچھا آدمی تو ہے نا۔ میرا مطلب ہے کہ آج کل کسی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ تم دیارِ غیر میں ہو چال باز لوگوں سے بچ کر رہنا۔ پھر ہماری اور مغرب کی روایات میں بھی فرق ہے۔ تم ابھی بچے ہو، تم نے ابھی دُنیا نہیں دیکھی ہے۔" ماں نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"امی! جیک بہت اچھا لڑکا ہے اور میرا اچھا دوست بھی بن گیا ہے۔ آپ تو ابھی تک مجھے بچہ ہی سمجھتی ہیں۔ امی اب میں بڑا ہو گیا ہوں اور اچھے بُرے کی پہچان بخوبی کر سکتا ہوں۔" کاشف نے جھلاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! بچے چاہے کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہو جائیں ماں باپ کے لئے تو بچے ہی رہتے ہیں۔" ماں نے کہا۔

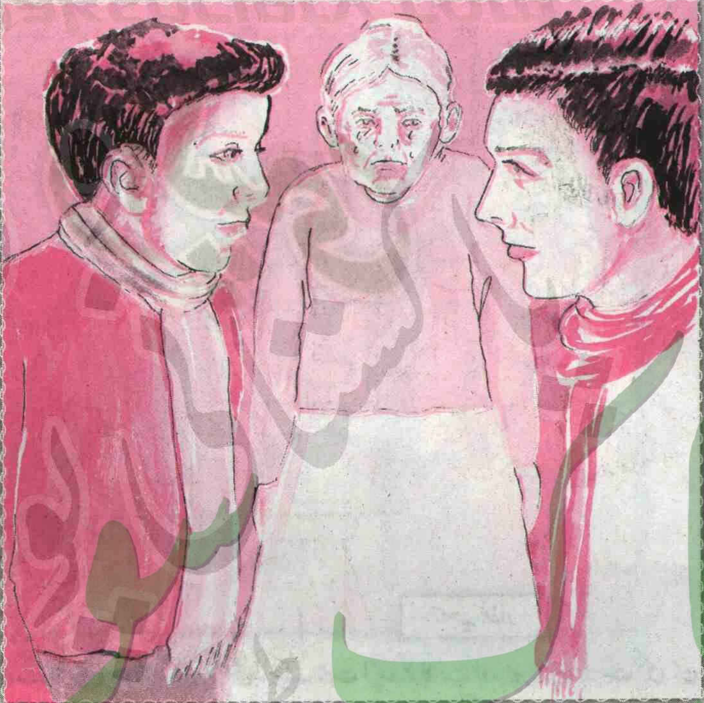
"اچھا امی اب میں اجازت چاہتا ہوں۔" کاشف نے بات ختم کر کے فون بند کر دیا۔

دُوسرے دن اتوار تھا۔ صبح کے وقت جیک کاشف کے پاس آیا اور اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

"چلنا کہاں ہے؟" کاشف نے پوچھا۔

"کوئی سوال نہیں۔ تمہیں ہمارے ملک کی ثقافت اور رسم و رواج دیکھنے کا شوق ہے نا تو چلو آج میں تمہیں ایک خاص روایت دکھانے لیے چلتا ہوں۔ آج کا دن ہمارے لئے بہت خاص ہے۔" جیک نے کاشف کو بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔

کاشف جیک کے ساتھ چل پڑا۔ جیک نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ جیک بہت خوش نظر آرہا تھا۔ راستے میں جیک نے ایک مارکیٹ کے سامنے گاڑی روکی اور وہاں سے ڈھیر ساری چاکلیٹس اور پھول لے آیا پھر جیک نے گاڑی سڑک پر دوڑا دی اور کچھ دیر بعد ایک بڑی سی عمارت کے سامنے جا کر گاڑی روک دی، اس



عمارت پر ''اولڈ ہوم'' کا بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔ کاشف اور جیک گاڑی سے اتر کر عمارت میں داخل ہوئے۔ جیک نے استقبالیہ پر موجود ایک خاتون کو بتایا کہ وہ مسز جولیا سے ملنے آئے ہیں۔ خاتون نے رجسٹر دیکھنے کے بعد انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ جیسے ہی دونوں اندر داخل ہوئے ایک بوڑھی عورت جیک سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

''یہ میری موم ہیں۔'' جیک نے کاشف سے کہا۔

''ہیلو آنٹی!'' کاشف بولا۔

''آج مدرز ڈے ہے، یہ دن سال میں صرف ایک بار آتا ہے اور مجھے بے چینی سے اس دن کا انتظار رہتا ہے، مجھے اپنی ماں سے جو ملنا ہوتا ہے۔''

''کیا تم سال میں صرف ایک بار ہی انہیں ملنے آتے ہو؟'' کاشف نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں۔'' جیک نے جواب دیا

''لیکن کیوں؟'' کاشف نے پوچھا۔

''کیوں کہ مدرز ڈے سال میں ایک بار ہی آتا ہے نا اس لئے۔'' جیک نے کہا۔

''اور باقی دن۔۔۔'' کاشف نے پوچھا۔

''سارا سال مختلف سرگرمیاں ہوتی ہیں، جیسے ایک دن ماں کا، ایک باپ کا۔ بالکل اسی طرح ہر دن کے لیے کوئی نہ کوئی سرگرمی ہے جو ہم لوگ بڑے اہتمام سے مناتے ہیں۔ یہ ہمارے یہاں کی خاص روایات ہیں جو صدیوں سے اسی طرح جاری ہیں۔ ہمیں اپنی ان روایات پر فخر ہے۔'' جیک نے سینہ تان کر کہا۔

کاشف بت بنا جیک کی باتیں سن رہا تھا کہ اچانک جیک کی ماں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی جو روتے ہوئے جیک سے کہہ رہی تھی: ''جیک بیٹا! مجھے یہاں سے لے چلو۔ یہاں میرا دل نہیں لگتا، مجھے ہر وقت تمہاری فکر رہتی ہے۔ جیک بیٹا جہاں تم اپنا پرانا سامان رکھتے ہو مجھے وہیں تھوڑی سی جگہ دے دینا، میں تمہیں بالکل پریشان نہیں کروں گی، بس تم مجھے یہاں سے لے جاؤ۔''

جیک پر اپنی ماں کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا، لیکن کاشف کی روح ضرور کانپ گئی۔ وہ فوراً اولڈ ہوم سے نکل کر پی سی او پہنچا اور اپنی ماں کو فون کر کے کہا۔

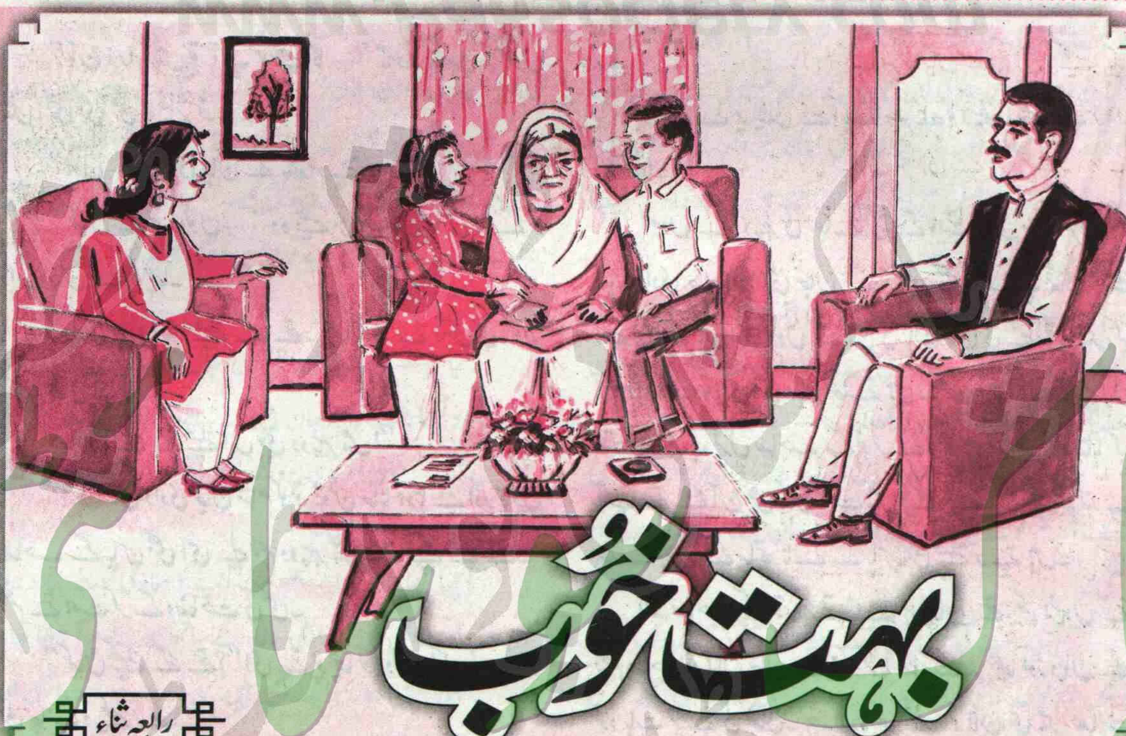
''امی! کیسی ہیں آپ؟ مجھے آپ کی بہت یاد آرہی ہے۔ میں جلد از جلد آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہاں بالکل بھی مزا نہیں آرہا ہے۔ یہاں کی اور ہماری روایات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ امی میں واپس آرہا ہوں۔''

''بیٹا! اب تم بڑے ہو گئے ہو میرے بغیر رہنا سیکھ لو۔'' ماں نے کاشف سے کہا۔

''نہیں امی ابھی میں بڑا نہیں ہوا، میں ابھی بھی بچہ ہی ہوں اور ویسے بھی آپ ہی تو کہتی ہیں نا کہ بچہ چاہے جتنا بڑا ہو جائے ماں باپ کے لیے تو بچہ ہی رہتا ہے۔'' کاشف نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''لیکن بیٹا!'' ماں نے کچھ کہنا چاہا تو کاشف نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

''امی! اس وقت میں فون بند کر رہا ہوں باقی باتیں آپ کے پاس آکر کروں گا۔'' اتنا کہہ کر کاشف نے فون بند کر دیا اور وطن واپس جانے کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ ☆☆



بہت خوب

رابعہ ثناء

کھٹ پٹ کی آواز پر دادی جان کچی نیند سے بیدار ہوئی تھیں۔ بیڈ کھڑکی کے ساتھ ہی تھا سو انہوں نے سفید جالی کے پردے کو ذرا سا ہلا کر دیکھا۔ انعم اور حارث چپکے سے گیٹ سے باہر جا رہے تھے اور اُن کے ہاتھ میں کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز بھی تھی۔

"ارے!...... یہ دونوں پھر دوپہر میں باہر نکل گئے......"

دادی جان نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے سوچا۔ کچی نیند سے اٹھنے کے باعث ان کی آنکھوں میں سرخ لکیریں بن گئی تھیں اور ان لکیروں کے ساتھ ہی گہری سوچ نے بھی آنکھوں میں ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے بار بار کپڑے میں لپٹی وہ چیز آ رہی تھی جو حارث نے اپنی بغل میں دبا رکھی تھی۔

مراد آباد کے علاقے میں بنا ہوا یہ صاف ستھرا گھر احمد علی صاحب کا تھا، جس میں ان کے ساتھ ان کی بیگم میمونہ احمد اُن کے بچے حارث احمد اور انعم احمد جو بالترتیب آٹھویں اور چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے اور بچوں کی پیاری دادی جان رہا کرتی تھیں۔ ہر اچھے گھر کی طرح اس گھر میں بھی دادی جان کے احکامات کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ باہم اتفاق سے رہنے کے باعث اس گھرانے کی مثالیں دی جاتی تھیں، مگر کچھ دنوں سے دادی جان کے دل کو عجیب پریشانی لاحق تھی۔ حارث اور انعم کی حرکتیں کچھ مشکوک سی ہوتی جا رہی تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوتے ہی دونوں بچوں کی حرکات وسکنات میں عجیب تبدیلی آئی تھی۔ دوپہر ہوتے ہی جب سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں آرام کی غرض سے چلے جاتے تو یہ دونوں بچے چپکے سے مین گیٹ کھول کر باہر نکل جاتے۔ سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ دُوسرے روز ان کے پاس کپڑے میں لپٹی کوئی چیز ہوتی جو کبھی تو حارث نے بغل میں دبائی ہوتی اور کبھی احتیاط سے ہاتھوں میں پکڑی ہوتی۔

"ارے میمونہ!...... یہ بچے آج پھر غائب ہیں گھر سے...... مجھے تو اب ڈر سا محسوس ہونے لگا ہے......" ایسے چپکے چپکے پہلے تو انہوں نے کوئی کام نہیں کیا...... اب جانے کیا ہوا ہے؟"

دوپہر ڈھلنے پر دادی جان عصر کی نماز پڑھ کر کمرے سے نکلیں تو کہے بغیر نہ رہ سکیں۔

"جی اماں!...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... آج بھی میں اٹھی تو مین گیٹ کھلا تھا۔ انہیں اتنا احساس نہیں کہ حالات کس قدر خراب ہیں اور یہ تپتی دوپہر میں گھر کھلا چھوڑ کر جانے کہاں گھومنے نکل جاتے ہیں۔"

''آج ذرا آلیں تو آپ پوچھیے گا.....'' میمونہ بیگم کی آنکھوں میں ابھی بھی خفگی کا تاثر تھا۔

''ہوں.....'' دادی جان نے کچھ سوچتے ہوئے۔

''کہاں تھے تم دونوں.....'' وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے تو دادی جان نے پوچھا۔

''دادی جان! ہم کھیلنے گئے تھے۔'' حارث نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

''کہاں گئے تھے کھیلنے اس تپتی دوپہر میں!''

''اصل میں دادی جان شام کو تو ٹیوشن جانا ہوتا ہے اور قاری صاحب کے پاس بھی اسی لیے ہم دوپہر میں کھیلنے چلے گئے تھے۔'' انعم نے ہمت کر کے وضاحت کی تھی۔

''کہاں کھیلنے گئے تھے؟'' امی نے پوچھا تو دونوں ایک دُوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

''وہ امی جان!..... وہ بستی کے بچوں کے ساتھ.....'' حارث کی آواز خاصی پست تھی۔

''کیا؟'' دادی جان کی آواز بے اختیار بلند ہوئی تھی اور امی کا منہ ہلکا سا کھل گیا۔

''وہ نالے کے پاس جو بستی ہے.....؟'' تم لوگوں کا دماغ درست ہے.....؟ ان بچوں کے ساتھ کھیلو گے تو ان جیسے ہی ہو جاؤ گے.....'' خبردار آئندہ میں نہ سنوں کہ تم لوگ وہاں گئے تھے۔ حارث! تم بڑے بھائی ہو۔ بہن کو لے کر کیسی کیسی جگہوں پر کھیلنے جاتے ہو..... اب سن لیا آئندہ وہاں نہیں جانا تم دونوں نے، اچھے گھروں کے بچوں کو دوست بناؤ۔ ان کے ساتھ کھیلا کرو۔'' دادی جان نے دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

''بھائی!..... اب ہم کیا کریں گے کیا واقعی ہم وہاں جانا چھوڑ دیں گے۔'' انعم نے پوچھا۔

''تم ہی بتاؤ کہ کیا کریں..... دادی جان نے واضح طور پر منع کر دیا ہے۔''

''لیکن وہ بچے کیا سوچیں گے..... مجھے تو خود کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔''

دونوں نے پریشانی سے ایک دُوسرے کو دیکھا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

انہوں نے دوپہر کی بجائے صبح کے وقت وہاں جانا شروع کر دیا۔ دادی جان اور امی جان اب مطمئن تھیں کہ بچے بُری صحبت سے بچ گئے ہیں اور انہوں نے اُن کی بات مان لی ہے، مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ ابھی بھی وہاں جاتے ہیں۔ انہیں اُس بات کا علم اُس وقت ہوا جب کرنل صاحب کے نوکر نے احمد علی صاحب کو بتایا کہ آپ کے بچے آج کل بُری صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے لگے ہیں۔ گندے مندے بچوں کے ساتھ نالے کے پاس ہی کھیلتے رہتے ہیں۔

احمد صاحب گھر آئے تو خاصے پریشان تھے، مگر انہوں نے بیگم صاحبہ اور اماں جان سے ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا اور بچوں سے خود بات کرنے کی ٹھانی۔ جب وہ گھر آئے تو لان ہی میں عدالت لگ چکی تھی۔ ابو صوفے پر بیٹھے دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔

''آؤ بچو! میرے پاس بیٹھو.....'' ابو جان نے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو ڈانٹ کے بجائے پیار سے سمجھانے کو ترجیح دیتے تھے۔

''آج کل کیا ہو رہا ہے، سکول کا کام مکمل ہو گیا تم لوگوں کا۔'' انہوں نے تمہید باندھی تھی۔

''جی ابو جان! کام تقریباً مکمل ہے بس ریاضی کا تھوڑا سا کام اور باقی مضامین کی دھرائی رہ گئی ہے۔'' حارث نے جواب دیا۔

''چلو اچھی بات ہے تم لوگ کم از کم اپنی پڑھائی سے غافل نہیں۔'' ابو کی بات پر دونوں چونک گئے تھے۔

''کرنل صاحب کا ملازم فضل مجھے بتا رہا تھا کہ تم لوگ نالے کے پاس جو بستی ہے وہاں بچوں کے ساتھ کھیلنے جاتے ہو، کیا یہ بات سچ ہے.....؟''

''جی ابو جان!.....'' حارث نے جیسے اعترافِ جرم کیا۔ دادی جان بھی وہاں چلی آئی تھیں اور امی جان بھی کھانے کا کہنے آئیں تو اُن کی باتیں سن کر پریشانی سے وہیں بیٹھ گئیں۔

''بیٹا! آپ لوگ جانتے ہیں کہ وہ بچے کیسے ہیں۔ وہ نہایت

بدتمیز بچے ہیں۔ وہ گالیوں کا استعمال کرتے ہیں۔ پھر آپ لوگوں کو کیا ضرورت محسوس ہوئی ان بچوں کے ساتھ کھیلنے کی۔ جب کہ آپ خود دو بہن بھائی ہو۔ پھر پڑوس میں اچھے تمیز دار بچے موجود ہیں آپ اُن کو اپنے کھیل میں شریک کر سکتے ہیں۔'' وہ دونوں چپ چاپ سر جھکا کر بیٹھے تھے۔

''ایسے بچوں میں رہ کر تم لوگ بھی بگڑ جاؤ گے۔ اُس روز بھی میں نے منع کیا تھا...... باز نہیں آئے ناں تم لوگ......'' دادی جان نے خفگی سے اُن کی جانب دیکھا۔

''اور پھر گندے نالے کے پاس کتنے جراثیم ہوتے ہوں گے۔ اگر تم لوگ بیمار پڑ گئے تو!'' امی جان کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''آپ سب کی کوئی بھی بات غلط نہیں، لیکن آپ لوگ یقین رکھیں ہم لوگ نہ تو کوئی غلط کام کر رہے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی بُری صحبت کا شکار ہیں۔''

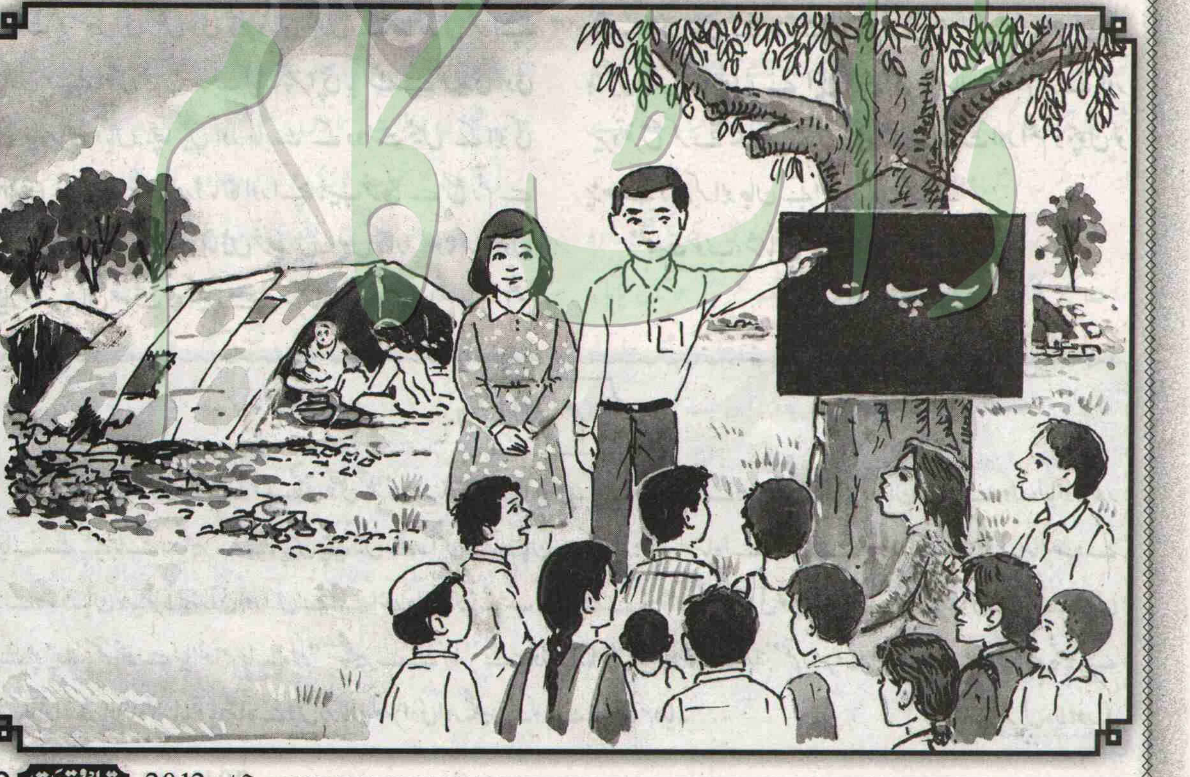
''ارے کیسے بُری صحبت کا شکار نہیں ہو...... اُن بچوں کے حلیے دیکھے ہیں تم دونوں نے...... ننگ دھڑنگ، نہ پاؤں میں جوتی نہ تن پہ کپڑا۔ ناک اُن کی بہہ رہی ہوتی ہے کیا سیکھو گے تم اُن سے......؟'' دادی جان کو غصہ آ گیا۔

''پیاری دادی جان! آپ ہمارے سیکھنے پر زور کیوں دے رہی ہیں وہ بھی تو ہم سے کچھ سیکھ سکتے ہیں۔'' انعم ایک دم دادی جان کے قدموں میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ''اگر اُن کی بُری صحبت میں ہمارے بگڑنے کا امکان ہے تو ہماری اچھی صحبت انہیں سنوار بھی تو سکتی ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' امی جان نے پہلے انعم اور پھر حارث کو دیکھا جب کہ ابو جان دھیرے سے مسکرا دیے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اطمینان اتر آیا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کے سمجھ دار بچے کچھ اچھا کام کر رہے ہیں۔

''اچھا ٹھیک ہے...... ہم آج آپ کو ساری بات بتا دیتے ہیں۔'' حارث بھی اٹھ کر دادی جان کے ساتھ صوفے پر آ بیٹھا تھا۔

''سکول میں ہماری ایک ٹیچر ہیں مس اُمامہ۔ وہ بہت اچھی اور ہماری پسندیدہ ٹیچر ہیں وہ ہم دونوں کو اسلامیات پڑھاتی ہیں۔ چھٹیوں سے پہلے انہوں نے اپنی ہر جماعت کے بچوں سے وعدہ لیا تھا کہ چھٹیوں میں ہم کوئی نہ کوئی ایسا کام ضرور کریں گے کہ جس سے ہمارا خدا ہم سے خوش ہو۔ ہم نے جب مس سے پوچھا کہ وہ



کیا کام ہے تو مس نے کہا کہ یہ آپ لوگ خود سوچیں۔ اسی لیے ہم دونوں نے بہت سوچنے کے بعد فیصلہ کیا کہ ان چھٹیوں میں ہم خود پڑھنے کے ساتھ ساتھ بستی کے ان گندے مندے بچوں کو بھی وقت دیں گے اور اگر ہم انہیں پڑھا نہ بھی سکے تو کم از کم ان میں شوقِ تعلیم ضرور پیدا کریں گے۔ اور انہیں بتائیں گے کہ اُن کی زندگی کا مقصد محض اِدھر اُدھر آوارہ گھومنا نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔'' حارث تفصیل سے بتانے لگا ''یہ کام کافی مشکل تھا۔ سب سے پہلے تو بچوں کو پڑھنے کی طرف مائل کرنا انتہائی مشکل کام تھا۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ ہم انہیں کھیل کھیل میں پڑھائی کی جانب لائیں گے۔ چنانچہ ہم پہلے پہل اُن کے ساتھ باتیں کرتے کبھی اُنہیں کسی چھوٹے موٹے کھیل میں شامل کرتے اور سب سے بڑھ کر اُن سے دوستی کرنے کی خاطر ہم اپنی پاکٹ سے روزانہ اُن کے لیے کوئی نہ کوئی چیز لے جانے لگے...... یوں وہ بچے ہم سے مانوس ہو گئے تو ایک دن ہم نے اُن کے ساتھ ایک نیا کھیل شروع کیا۔'' حارث نے اپنی بات کو ڈرامائی تاثر دے کر انعم کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں......'' حارث کے دیکھنے پر انعم نے بات کا آغاز کیا ''اور وہ کھیل تھا...... سکول سکول، ہم نے وہاں موجود ایک گھنے درخت کو سکول کی شکل دی پھر وہاں بچوں کے ساتھ مل کر اپنے سکول کو پہلے اچھی طرح صاف کیا۔ پھر اپنی پاکٹ سے خریدی ہوئی نئی چادریں وہاں بچھائیں اور حارث کے دوست نبیل کے ابو کی اکیڈمی سے ایک بلیک بورڈ مانگا اور اپنے جیب خرچ سے جمع رقم سے بچوں کے لیے کاپیاں اور کتابیں خریدیں۔ یوں ہمارا چھوٹا سا سکول تیار تھا۔ جہاں صرف دو ٹیچرز تھے۔ سر حارث اور میں انعم......'' انعم کے ہونٹوں پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی۔

دادی جان اور امی جان دم بخود سن رہی تھیں جب کہ ابو جان مسلسل مسکرا رہے تھے۔

''ہم نے پورے اڑھائی ماہ اسی کھیل کے چکر میں اُن بچوں کو پڑھایا اور اب جب کہ ہماری گرمی کی چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں تو وہ بچے نہ صرف اُردو پڑھنے کے قابل ہو گئے ہیں بلکہ انگریزی کے الفاظ بھی جوڑ توڑ کر کے پڑھ لیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان بچوں میں سکول جانے کی خواہش بھی پیدا ہو گئی ہے، یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہے۔''

''اور ہاں دادی جان! وہ جو آپ نے کہا کہ یہ بچے گندے مندے اور بدتمیز ہیں تو ابتداء میں ان بچوں کا واقعی یہی حال تھا، مگر اب ایسا نہیں۔''

''آپ سب کل ہمارے سکول آیئے گا۔'' انعم اور حارث نے بیک وقت دادی جان کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

دُوسرے دن دادی جان، ابو جان اور امی جان جب حارث اور انعم کے بنائے سکول میں گئے تو ان کے سر فخر سے بلند ہو گئے۔ وہ بچے جو گندے مندے تھے وہ زمین پر بیٹھے علم حاصل کر رہے تھے۔ دادی جان نے حارث اور انعم کو جی بھر کر پیار کیا اور ان کی بلائیں لیں۔ دونوں نے اپنی گرمی کی چھٹیاں آرام کرنے اور سیر و تفریح کرنے میں ضائع نہیں کی تھیں۔ حارث اور انعم کو بچوں کو پڑھاتے دیکھ کر ابو جان بے اختیار بول اٹھے۔

''بہت خوب، شاباش میرے بچو، بہت خوب۔''

☆......☆......☆

انعام

ایک دن ایک مچھیرے نے ایک قیمتی مچھلی پکڑی اور بادشاہ کو دینا چاہی۔ جب وہ بادشاہ کے دربار میں پہنچا تو دربان نے اسے روک لیا اور اندر جانے کے پیسے مانگے۔ مچھیرے کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اُس نے دربان سے کہا کہ جب بادشاہ اسے انعام دے گا تو وہ اسے انعام کا آدھا حصہ دے دے گا۔ دربان کو یہ شرط پسند آئی اور اُس نے اُسے اندر جانے دیا۔ جب مچھیرے نے بادشاہ کو مچھلی کھلائی تو بادشاہ کو مچھلی بہت پسند آئی۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: ''تم مجھ سے کیا انعام چاہتے ہو؟'' مچھیرے نے کہا: ''مجھے سو کوڑے ماریں۔'' بادشاہ نے کہا: ''تم یہ سزا کیوں مانگ رہے ہو؟'' پھر مچھیرے نے سارا قصہ بادشاہ کو سنایا تو بادشاہ نے اس دربان کو سزا دی اور مچھیرے کو بہت بڑا انعام دیا۔

(آفتاب عدیل، لاہور)



خواب گاڑی

ابنِ آس محمد

یہ کہانی اُن بچوں کے لیے ہے جنہیں نیند نہیں آتی، اگر آپ کے ساتھ بھی ایسا ہے تو یہ کہانی ضرور پڑھیے۔

کسی علاقے میں بلو نام کا ایک بچہ رہتا تھا۔ ایک رات وہ بستر پر لیٹا تو بہت کوشش کے باوجود سو نہ سکا۔ نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ اصل میں کچھ دن پہلے اس کا داخلہ نئے سکول میں ہوا تھا اور وہ اسی وجہ سے فکر مند تھا۔ نئے سکول میں ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود وہ ابھی تک ایک بھی دوست نہیں بنا سکا تھا۔ اس کی کلاس کے سارے بچے بہت اچھے تھے، مگر بلو بہت شرمیلا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ان سے کیا بات کرے اور کس طرح انہیں دوست بنائے؟

یہی پریشانی تھی جس کی وجہ سے اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ رات بھر پلنگ پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اور ٹھیک طرح سو نہیں پایا۔ اس کی امی آدھی رات کو کسی کام سے باورچی خانے میں جانے لگیں تو وہ بلو کے کمرے میں روشنی دیکھ کر اس کے کمرے میں آئیں۔ بلو پڑھنے کے لئے کوئی کتاب تلاش کررہا تھا۔ اس کی امی نے کہا۔

''بیٹا، سوجاؤ، اگر دیر تک جاگو گے تو سکول جانے کے لیے صبح نہیں اُٹھ سکو گے۔''

بلو بولا: ''امی جان، میں بہت کوشش کرچکا ہوں مگر مجھے نیند ہی نہیں آرہی۔''

''اوہ تو یہ بات ہے۔'' اس کی امی مسکرا کر بولیں۔

''اگر تم گہری اور پُرسکون نیند سونا چاہتے ہو تو خواب گاڑی کو آواز دو۔ وہ بہت خوب صورت کشتی ہے اور خواب میں سفر کرتی ہے۔ اسے چاندی اور سونے سے بنایا گیا ہے اور اس پر سونے کی موٹی موٹی رسیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ اس کا عرشہ سیاہ اور چمک دار ہے اور چاندی کی ہونے کی وجہ سے وہ جھلمل کرتی محسوس ہوتی ہے۔ خواب گاڑی ہر رات آسمانوں پر سفر کرتی ہے اور جادوئی دُنیا کی سیر کراتی ہے۔ تم خواب گاڑی کو آواز دو، وہ تمہیں خواب کی دُنیا میں لے جائے گی اور پھر تمہیں جلد ہی نیند آجائے گی۔''

بلو بہت سنجیدہ لڑکا تھا۔ اسے خواب گاڑی جیسی تصوراتی چیزوں اور جادوئی دُنیا پر بالکل یقین نہیں تھا۔ جب اس کی امی جان چلی گئیں تو وہ ایک بار پھر پلنگ کے گرد چہل قدمی کرنے اور جھنجھلا جھنجھلا کر فرش پر پیر مارنے لگا۔ آخر کار وہ اس قدر تھک گیا کہ اس نے سوچا چلو ایک مرتبہ خواب گاڑی کو آواز دے کر یہ تجربہ بھی کرلینا چاہئے۔ حالاں کہ اسے یہ خیال ہی احمقانہ اور فضول لگ رہا تھا۔

اس نے بستر پر دراز ہوکر آنکھیں بند کرلیں اور سرگوشیوں میں پکارنے لگا۔

''خواب گاڑی...... اے حسین خواب گاڑی، خواب میں سفر کرنے والی کشتی آجاؤ...... آ بھی جاؤ۔''

مگر کچھ نہ ہوا۔ تاہم اس نے آنکھیں سختی سے بند رکھیں اور ذرا تیز آواز میں پکارنے لگا اور پکارتا ہی چلا گیا اور پھر نہ جانے کب اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بال ہوا میں اڑنے لگے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی نمک کی خوش بو اس کے نتھنوں سے ٹکرانے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا چھٹنے لگا اور اس نے دیکھا کہ وہ ایک بندرگاہ پر کھڑا ہے اس کے سامنے لہریں مارتے، اُتھل پتھل ہوتے پانی میں ایک سنہری کشتی ہچکولے کھا رہی ہے۔

یہ خواب گاڑی تھی۔ خواب میں سفر کرنے والی کشتی، خواب گاڑی۔ اس کے بادبان چاندی کے کپڑے سے بنے تھے اور اس میں بندھی ہوئی رسیاں سونے کے تاروں کو بٹ کر بنائی گئی تھیں۔ اس کا عرشہ نہایت سیاہ اور چمک دار تھا۔ اور باقی کشتی نہایت سفید، شفاف اور چمک دار تھی۔

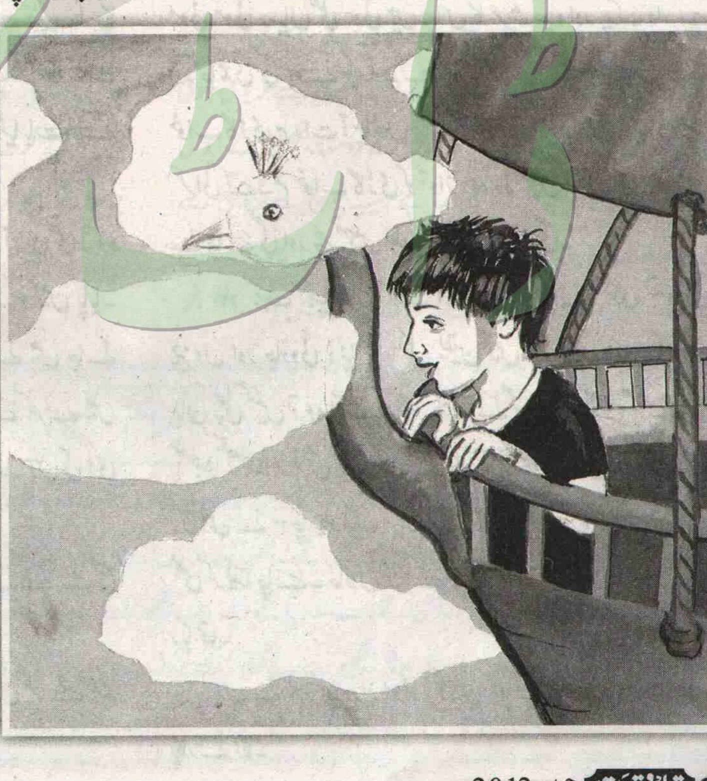
بلو اچھل کر خواب گاڑی پر سوار ہوگیا۔ اس کے سوار ہوتے ہی کشتی پر موجود چاندی کے بادبانوں میں اچانک انتہائی تیزی سے ہوا بھرنے لگی اور سونے کی سنہری رسیاں سختی سے تن گئیں۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں خواب گاڑی حرکت میں آ گئی۔

بلو کا خیال تھا کہ وہ پانی میں سفر کرے گی مگر اس کی توقع کے برعکس خواب گاڑی نے فضا میں اڑنا شروع کر دیا اور ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی بادلوں میں پہنچ گئی اور پھر اُوپر ہی اُوپر اڑتی چلی گئی۔ کچھ ہی دیر میں پانی، بندرگاہ پھرحتیٰ کہ دُنیا کی ہر چیز اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اب خواب گاڑی بادلوں کے درمیان نہایت تیزی سے تیرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ بلو بڑے فخر اور اعتماد کے ساتھ خواب گاڑی کے عرشے پر کھڑا بادلوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ اس کے بال ہوا کی تیزی کے باعث اڑ رہے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو کبھی اتنا خوش محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا نہایت عجیب اور حیرت انگیز تجربہ تھا۔

تقریباً آدھ گھنٹہ سفر کرنے کے بعد خواب گاڑی نہایت آہستگی سے کسی رحم دل پرندے کی طرح نیچے اترنا شروع ہوگئی۔ کچھ ہی دیر میں بادل اُوپر رہ گئے اور بلو کو ایک جزیرہ نظر آنے لگا۔ جزیرے کے اِرد گرد نیلا جھلمل کرتا، لشکارے مارتا پانی تھا۔ خواب گاڑی پانی پر اتر گئی اور نہایت دھیمے انداز میں پانی پر تیرتے ہوئے ساحل کی طرف بڑھنے لگی۔

جزیرے پر بہت سے درخت نظر آرہے تھے۔ خواب گاڑی تیزی سے چلتی رہی اور کچھ ہی دیر میں ایک پُرسکون جگہ جا کر رک گئی۔ یہ جزیرے کا ایک کھلا حصہ تھا۔ خواب گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ ایک بار پھر فضا میں بلند ہوئی اور درختوں کے اُوپر اڑنے لگی، کافی دُور جا کر، ایک صاف ستھری جگہ نظر آئی تو خواب گاڑی آہستہ آہستہ نیچے اتر گئی، بالکل کسی ہیلی کاپٹر کی طرح۔ ہری ہری گھاس اس کے چاروں طرف لہرا رہی تھی۔





پھاڑے اس عجیب وغریب خواب گاڑی اور جزیرے کی باتیں سنتے رہے۔ کچھ ہی دیر میں سب بچے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس سے آئس کریم کی جھیل اور ٹافیوں کے درختوں کی باتیں کرتے رہے۔ بلو مزے لے کر سب کو اپنے سفر کی کہانی سناتا رہا۔

اب بلو بہت خوش تھا۔ بہت سے بچے اس کے دوست بن گئے تھے۔ اگلی رات بھی بلو نے خواب گاڑی کو بلایا اور اس پر سوار ہو کر ایسے جزیرے پر پہنچا جہاں دُنیا بھر کے عجیب وغریب پرندے اور خوب صورت جانور تھے۔ ان میں تقریباً ہر رنگ کے چھوٹے بڑے، پرندے موجود تھے۔ بلو ساری رات ان کے درمیان کھیلتا رہا۔ پرندوں کے گیت اور جانوروں سے طرح طرح کی عجیب وغریب اور دل چسپ کہانیاں سنتا رہا۔ اس نے ایسے ایسے ذائقوں کے پھل اور میوے کھائے جو دُنیا میں کہیں نہیں ملتے تھے۔

بلو نے ٹی وی پر اور کتابوں میں سینکڑوں مرتبہ جزیرے دیکھے تھے، مگر یہ جزیرہ ان سب سے مختلف تھا۔ یہاں نظر آنے والے سارے پہاڑ، چٹانیں اور پتھر، مصری یا چینی کے بنے ہوئے تھے۔

بلو خواب گاڑی سے اتر گیا اور چاکلیٹ سے بنی ہوئی پگ ڈنڈی پر چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد اسے ایک جھیل نظر آئی۔ جس کا پانی گلابی تھا۔ اس نے قریب جا کر پانی کو چھوا تو یہ جان کر حیران رہ گیا کہ جھیل میں پانی نہیں بلکہ نہایت لذیذ اور خوش ذائقہ آئس کریم تھی۔

اس کے اِرد گرد جتنے بھی درخت تھے ان پر دُنیا کے تمام ذائقوں کی چاکلیٹیں اور ٹافیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے جی بھر کر ٹافیاں، چاکلیٹ اور آئس کریم کھائی اور جب اس کا دل بھر گیا تو وہ واپس خواب گاڑی پر پہنچا اور مزے سے سفر کرتا ہوا اپنے گھر واپس آ گیا اور پھر صبح تک گہری نیند سوتا رہا۔

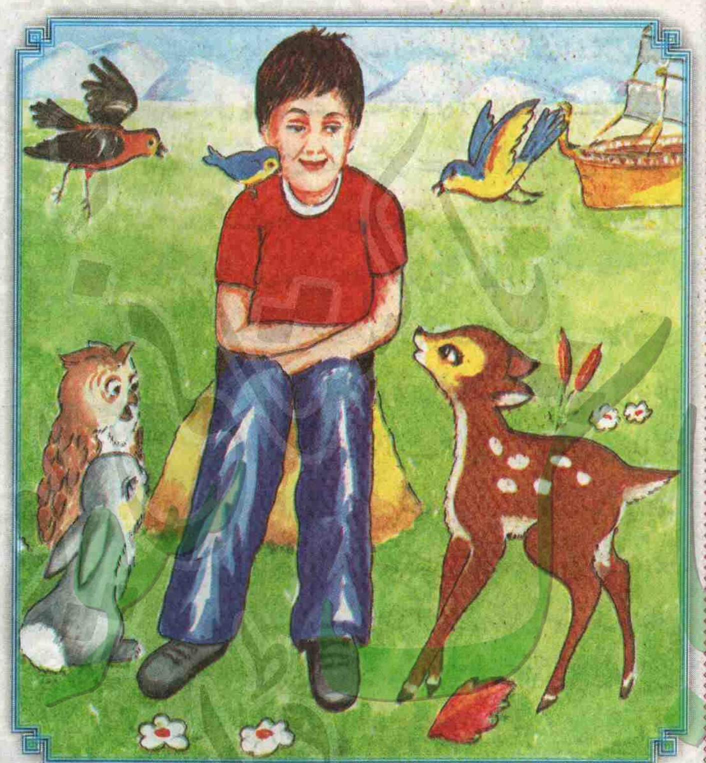
اگلی صبح وہ سکول گیا تو اس نے اپنے ہم جماعتوں کو اس خواب کے بارے میں بتایا۔ سب حیرت کے مارے منہ کھولے اور آنکھیں

پرندوں نے اسے جو گیت سنائے، جانوروں نے جو کہانیاں سنائیں، ان میں سے بہت سی ایسی تھیں جن کو سن کر وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا اور بعض ایسی کہ اس کا دل بھر آیا۔ غرض عجیب دُنیا تھی، بلو کو بڑا مزا آیا اور پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ رات تیزی سے ختم ہونے لگی ہے۔ بلو نے ان سے اگلی رات آنے کا وعدہ کیا اور جلدی سے خواب گاڑی کے ذریعے گھر واپس آ گیا۔

اگلے دن جب وہ سکول پہنچا تو سکول کے میدان میں بہت سارے بچے آدھی چھٹی میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب بے چین تھے کہ بلو آئے اور انہیں اپنے تازہ خواب کی باتیں اور دل چسپ قصے سنائے۔

بلو ان کے درمیان بیٹھ گیا اور پھر اس نے پرندوں کے جزیرے کی ساری باتیں بتانا شروع کر دیں اور پھر وہ کہانیاں بھی سنائیں جو پرندوں اور جانوروں نے اسے سنائی تھیں۔

اگلی رات ایک بار پھر بلو خواب گاڑی کے ذریعے کسی اور



عجیب و غریب دُنیا میں پہنچا اور پھر عجیب عجیب جزیروں کا سفر کرنا اس کا مشغلہ بن گیا۔ یہ سارے ایڈونچر اس کے لئے تو حیرت انگیز تھے ہی، سکول کے بچوں کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہ تھے۔

بعض بچے اس کی کہانیاں سن کر خوف زدہ ہوئے تو بعض کو بڑا مزا آیا، تاہم وہ سب بے چینی سے ہر روز اس کا انتظار کرنے لگے تاکہ وہ آئے اور انہیں عجیب و غریب کہانیاں سنائے۔ اس کی کہانیاں رفتہ رفتہ سکول میں مشہور ہونے لگیں اور جلد ہی سکول کا ہر بچہ اس کا دوست بن گیا۔

رفتہ رفتہ وہ بھی بڑا ہوتا رہا جب وہ نوعمر ہوگیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بچوں کی کہانیاں لکھا کرے گا تاکہ اس کی کہانیاں اس کے ملک کے سارے بچے اور دُنیا بھر کے بچے پڑھ سکیں۔ پھر اس نے خواب گاڑی کی ساری کہانیاں لکھ ڈالیں۔ یہ کہانیاں بچوں کے رسالوں میں شائع ہونے لگیں، اور اس کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی۔

آج وہ ملک کا مقبول ترین مصنف ہے اور بچے اس کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

اگر آپ کو کبھی رات کو نیند نہ آئے تو بلو کی طرح ایک مرتبہ خوابوں میں سفر کرنے والی خواب گاڑی کو آواز دے لینا......

ہمیں یقین ہے وہ آپ کو بھی عجیب و غریب دُنیا کی سیر کرائے گی اور پھر ممکن ہے آپ بھی بہت اچھے مصنف بن جائیں، بالکل بلو کی طرح۔

آزمائش شرط ہے، طریقہ ہم بتا دیتے ہیں۔

جن بچوں کو صبح سکول جانا ہوتا ہے، وہ بچے رات آٹھ بجے بستر پر چلے جائیں، آنکھیں بند کرلیں، اور یہ گیت گائیں، دل ہی دل میں اور بغیر آواز کے۔

خواب گاڑی، خواب گاڑی
تیری دُنیا کتنی پیاری
سونا چاندی تیرا تن من
تیرا میرا سچا بندھن
مجھ کو سلا کر، خواب میں آکر
لے جا مجھ کو دُور کہیں پر
خواب گاڑی، خواب گاڑی
تیری دُنیا کتنی پیاری
بادل کے اس پار چلیں گے
جادو کی دُنیا میں رہیں گے
آئس کریم، چاکلیٹ اور مٹھائی
کھائیں گے اور جیب بھریں گے
خواب گاڑی، خواب گاڑی
تیری دُنیا کتنی پیاری

یہ گیت بار بار دل ہی دل میں گاتے ہوئے اس وقت تک آنکھیں بند کر کے لیٹے رہیں، جب تک خواب گاڑی آ نہیں جاتی، اگر آپ نے ایک لمحے کے لیے بھی آنکھیں کھول دیں تو خواب گاڑی نہیں آئے گی۔ نیند بھلے سے آ جائے۔



شیر شاہ سوری

شیر شاہ سوری کا شمار انصاف پسند و قابل مسلمان بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ آپ کا اصل نام فرید خان تھا۔ شیر شاہ نے فارسی، ادب، تاریخ و فارسی زبان کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد صوبہ بہار میں سلطان محمد کی نوکری کر لی۔ ایک دن شیر نے سلطان محمد پر حملہ



کیا تو فرید خان نے جان پر کھیل کر اُسے بچایا یوں فرید خان بن گیا شیر شاہ سوری! سلطان محمد نے اسے یہ لقب عطا کیا تھا۔ 1528ء میں سلطان کے انتقال کے بعد وہ بہار کا خود مختار بادشاہ بن گیا۔ مغل بادشاہ ہمایوں کو شکست دے کر وہ پورے ہندوستان کا حکمران بن گیا۔ شیر شاہ سوری نے یوں تو عدل و انصاف، تعلیم و صحت کے شعبے میں بڑے بڑے کام کیے، مگر تاریخ میں اسے پورے ملک میں پکی سڑکیں بنوانے پر یاد کیا جاتا ہے۔ ایک سڑک بنگال سے آگرہ، دُوسری دہلی سے پشاور، آگرہ سے بنارس اور لاہور سے ملتان تک بنائی گئی۔ جی ٹی روڈ شیر شاہ سوری کے دور میں بنائی گئی تھی۔ دہلی کا قلعہ اور جہلم کا قلعہ روہتاس بنانے کے کارنامے بھی اسی بادشاہ کے ہیں۔ اس عظیم مسلمان حکمران کا انتقال بارود میں آگ لگنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس عظیم فاتح نے 22 مئی 1545ء کو وفات پائی تھی۔

نرسنگ

دُنیا بھر میں ہر سال 12 مئی کو انٹرنیشنل نرس ڈے منایا جاتا ہے۔ اس مقدس پیشے کی بنیاد تو مسلمانوں کے دور میں اس وقت رکھ دی گئی تھی جب نبی پاک ﷺ کے زمانے میں خواتین زخمی صحابہؓ کا میدانِ جنگ میں علاج معالجہ کیا کرتی تھیں۔ جدید دور میں یہ پیشہ بہت ترقی کر چکا ہے۔ نرسنگ کے شعبہ میں یونیورسٹی اور کالجز ڈگریاں جاری کرتے ہیں۔ اسی لیے اب اسے ''نرسنگ



سائنس'' کے مضمون کا نام دیا گیا ہے۔ اکتوبر 1853ء سے فروری 1856ء تک جاری روسی قوم اور اتحادیوں (فرانس، انگلینڈ وغیرہ) کی CRIMEAN جنگ میں ایک برطانوی خاتون FLORENCE NIGHTINGALE نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ فلورنس 12 مئی 1820ء کو لمبیا ولا اٹلی کے شہر فلورنس میں پیدا ہوئی۔ شہر کے نام پر اس کا نام رکھا گیا۔ یہ خاتون ایک نرس، ادیبہ اور ماہرِ شماریات تھی۔ فلورنس نے لندن میں نرسنگ سکول قائم کیا۔ ترکی میں فلورنس کے نام پر 4 ہسپتال قائم

ہیں۔ 1952ء میں جاپان میں پہلی نرسنگ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ ''ہندو پاک میں نرسنگ کی تاریخ'' نامی کتاب بھی موجود ہے جو A.WILKINSON نے 1858ء میں لکھی تھی۔ پاکستان میں بھی نرسنگ کے شعبے نے بڑی ترقی کی ہے۔ پاکستان سمیت دُنیا بھر میں نرس کو "SISTER" بھی کہا جاتا ہے۔

چاغی

صوبہ بلوچستان کے شہر چاغی نے 28 مئی 1998ء سے عالمی شہرت حاصل کر لی ہے، اس کے پہاڑوں میں پاکستان نے ایٹمی دھماکے کر کے دُنیا میں پہلے اسلامی ایٹمی قوت کے حامل ملک ہونے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ رقبے کے اعتبار سے یہ صوبے کا سب سے بڑا شہر ہے جس کا بارڈر ایران اور افغانستان کے ساتھ ملتا ہے۔ مئی 1898ء میں اسے ضلع کا درجہ ملا۔ اس کا کُل رقبہ 50545 سکوائر میٹر ہے۔ 2005ء کی مردم شماری کے مطابق اس



کی آبادی اڑھائی لاکھ ہے۔ اس صوبے کے شمال میں افغانستان اور مشرق میں قلات جب کہ جنوب میں ضلع خاران اور مغرب میں ایران واقع ہے۔ یہ ضلع سطح سمندر سے 850 میٹر بلند ہے۔ چاغی دراصل دو حروف ''چا'' اور ''گئے'' سے لیا گیا ہے۔ ''چا'' کا مطلب ہے کنواں اور ''گئے'' کا مطلب ہے زیرِ زمین پانی۔ یعنی کنوؤں کی جگہ۔ عرب اور ایران کے تاجر صدیوں سے ہندوستان اور چین سے تجارت اسی راستے پر کرتے رہے ہیں۔ اس ضلع میں 72 قبائل آباد ہیں۔

انار

انار (POMEGRANATE) کا تعلق ان خوش قسمت پھلوں میں ہے جن کا تذکرہ اللہ رب العزت نے قرآن، انجیل اور توریت جیسی مقدس کتابوں میں کیا ہے۔ انار کا سائنسی نام "PUNICA GRANATUM" ہے۔ جس کا تعلق "LYTHRACEAE" خاندان سے ہے۔ انار کا درخت جسامت میں چھوٹا ہے جسے کبھی کبھار زیبائشی طور پر بھی لگایا جاتا ہے۔ انار بنیادی طور پر ایرانی پھل ہے۔ ایران کا قومی پھل بھی انار ہے۔ اس کے علاوہ ترکی، شام، مصر، آذربائیجان، افغانستان، بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، عراق، لبنان، چین، سعودی عرب، اُردن اور اسرائیل میں بھی یہ پھل کاشت کیا جاتا ہے۔ اس کے پتے 3 سے 7 سینٹی میٹر لمبے اور 2 سینٹی میٹر چوڑے ہوتے ہیں۔



پھول شوخی مائل سرخ ہوتے ہیں۔ سائنسی لحاظ سے انار کے پھل کو Berry کہتے ہیں۔ انار کا شمار دُنیا کے قدیم ترین پھلوں میں ہوتا ہے۔ یہ پھل چار ہزار قبلِ مسیح کاشت ہونا شروع ہوا تھا۔ انار میں کاربوہائیڈریٹس، پروٹین، ریشے اور چکنائی کے علاوہ آئرن، کیلشیم، فاسفورس، زنک، پوٹاشیم اور وٹامن A، وٹامن B، وٹامن C اور وٹامن E پائے جاتے ہیں۔ انار دل، جگر، جوڑوں کے درد اور سرطان کے لیے مؤثر ہوتا ہے۔



میٹرک

بس میں سفر کے دوران ایک لڑکے کا ہاتھ ایک آدمی کی جیب سے ٹکرا گیا، وہ آدمی غصے سے بولا: ”تم کیا کر رہے ہو؟“

لڑکا: (معصومیت سے) ”جی میں گورنمنٹ سکول سے میٹرک کر رہا ہوں۔“

(بریعہ سلیم، لاہور)

یاد

میزبان: (مہمان سے) ”آپ کو ہمارے پاس آئے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں، کیا آپ کو اپنے بچوں کی یاد نہیں آتی؟“

”آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی میں ابھی فون کر کے انہیں یہاں بلا لیتا ہوں۔“

(تحریم فاطمہ، لاہور)

ٹھاہ

بازار میں بم دھماکے کے بعد رپورٹر ایک زخمی لڑکی کے پاس پہنچا اور پوچھا: ”جب بم گرا تو کیا وہ ایک دم پھٹ گیا تھا؟“

زخمی لڑکی نے غصے سے کہا: ”جی نہیں وہ رینگتے ہوئے میرے قریب آیا اور بولا، باجی...... ٹھاہ!“

(شانزہ عادل، کلورکوٹ)

تربیت

جج: (چور کے باپ سے) ”آپ نے اپنے بیٹے کی اچھی تربیت کیوں نہیں کی؟“

چور کا باپ: ”جناب! تربیت تو میں نے بہت اچھی کی تھی، مگر یہ کم بخت ہر بار پکڑا جاتا ہے۔“

(حافظہ سمیرا مشتاق، ملتان)

ربڑ

ایک بے وقوف (دُوسرے سے): میں اس دُنیا کو مٹا دوں گا۔“

دُوسرا بے وقوف: ”میں تمہیں ربڑ ہی نہیں دوں گا۔“

(آفتاب عدیل، لاہور)

سیاح

ایک سیاح کو دورانِ سفر بھوک لگی تو وہ ایک ہوٹل میں گیا۔ دُور افتادہ گاؤں کا وہ واحد ہوٹل تھا۔ اس نے چند انڈوں اور چائے کا آرڈر دیا۔ بل آیا تو رقم دیکھ کر سیاح حیران رہ گیا کیوں کہ بل میں ایک انڈے کی قیمت سو روپے درج تھی۔

سیاح نے بل دیکھ کر تعجب کا اظہار کیا اور اس سے پوچھا:

”کیا اس جگہ انڈوں کی قلت ہے؟“

”نہیں، نہیں......!“ ہوٹل والے نے جواب دیا۔

”پھر آپ نے بل میں اتنی رقم کیوں لکھی ہے؟“

”بات دراصل یہ ہے کہ جناب......!“ ہوٹل والے نے کہا۔ ”یہاں انڈے تو بہت مل جاتے ہیں، لیکن سیاح کبھی کبھی ملتے ہیں۔“

(آمنہ اویس، فیصل آباد)

دُوسری صلاحیت

علی اور آصف پارک میں کھیل رہے تھے۔

علی: ”مجھ میں دو صلاحیتیں ایسی ہیں جو کسی اور میں نہیں۔“

آصف: ”وہ دو صلاحیتیں کون سی ہیں؟“

علی: ”پہلی صلاحیت یہ ہے کہ مجھے سب کچھ یاد رہتا ہے۔“

آصف: ”اور دُوسری صلاحیت!“

علی: ”وہ تو میں بھول ہی گیا ہوں۔“

(ہمایوں رشید، اسلام آباد)

فیس

حمزہ: ”ڈاکٹر صاحب! آپ کی فیس کیا ہے؟“

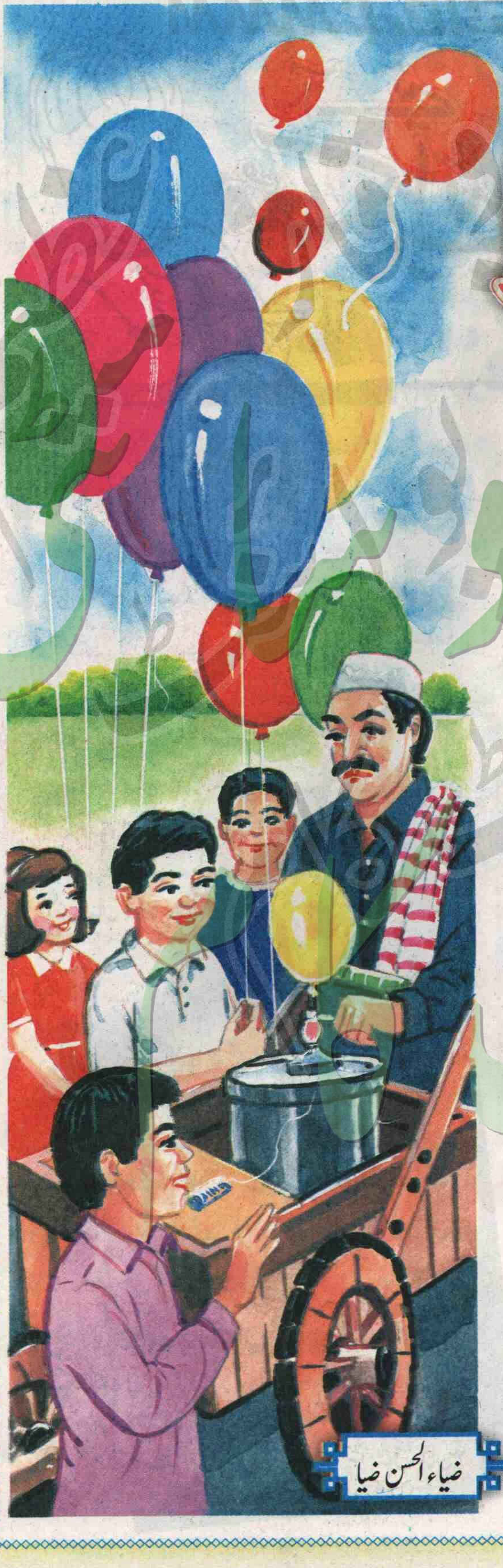
ڈاکٹر: پہلی مرتبہ آنے پر سو روپے فیس لیتا ہوں، اس کے بعد کوئی فیس نہیں لیتا۔

حمزہ: تو آپ سمجھیں میں دُوسری مرتبہ آیا ہوں۔

ڈاکٹر: ”آپ وہی دوا استعمال کرتے رہیں جو میں نے پچھلی مرتبہ آپ کے لیے تجویز کی تھی۔“

(عبداللہ ایوب، جہلم)

غبارے والا



ضیاء الحسن ضیا

آؤ بچو! لے لو غبارے جلدی جلدی آؤ
گیس بھرے غبارے لے کر اُونچا انہیں اُڑاؤ

میں غبارے والا میرا نام ہے کرمو بچو
سارے بچے بوڑھے کرمو چاچا کہتے مجھ کو

گلیوں گلیوں بیچوں غبارے میں آواز لگا کے
رنگ برنگے مجھ سے غبارے بچے خریدیں آ کے

حمزہ گیس بھرا غبارہ لے کے جب گھر پہنچا
چُھٹ گیا اس کے ہاتھ سے دھاگا اڑ گیا پھر غبارہ

تکتی رہ گئیں اس کی امی ، رونے لگا پھر حمزہ
امی بولیں چپ ہو جاؤ دُوسرا کل لے لینا

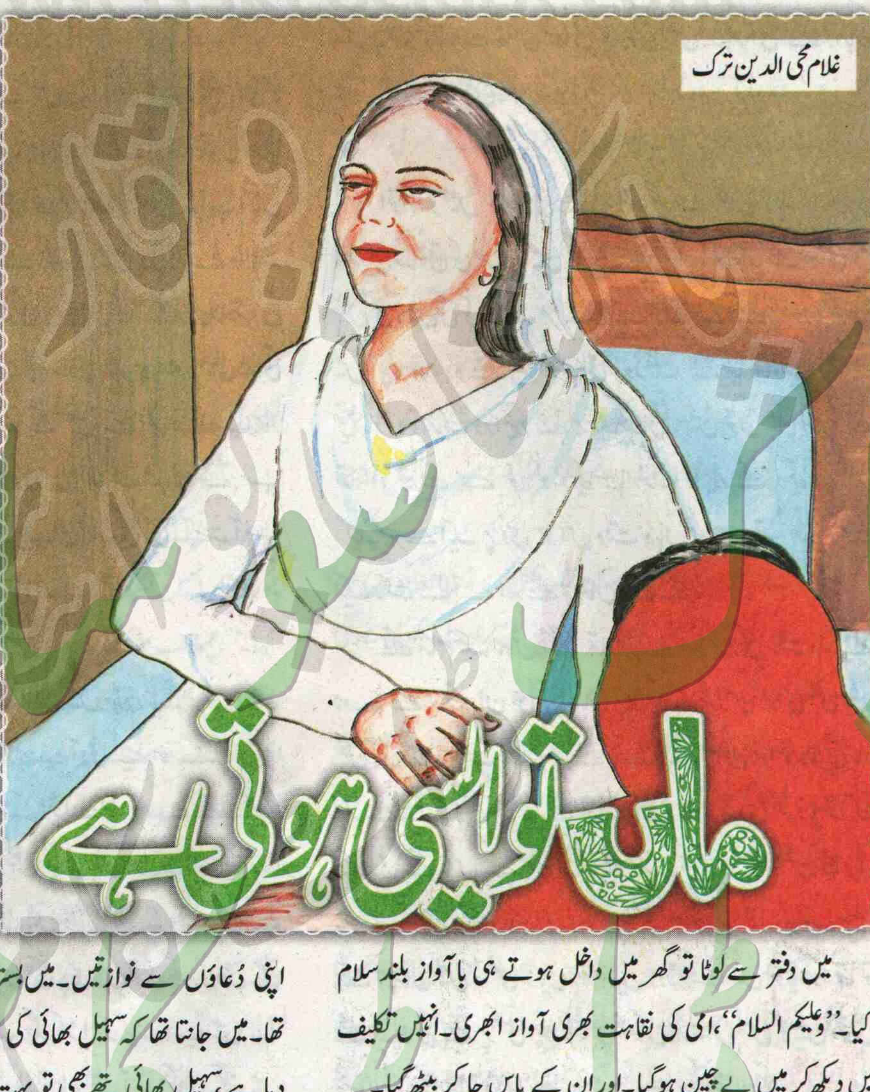
پھٹا جو منے کا غبارہ جنو ڈر کے بھاگے
جا ٹکرائے بکرے سے جو کھڑا تھا اُن کے آگے

اٹھ کر فوراً کپڑے جھاڑے گھر سے لائے پیسے
پارک میں جا کر بیٹھ گئے وہ نیا غبارہ لے کے

لال گلابی نیلے پیلے پیارے ہلکے پھلکے
کوئی دھاری والے غبارے کوئی گول اور لمبے

شوق سے بچے غباروں سے کھیلیں دل بہلائیں
ہوا نکال کے غباروں کی اپنے منہ سے پھلائیں

غلام محی الدین ترک



ماں تو ایسی ہوتی ہے

میں دفتر سے لوٹا تو گھر میں داخل ہوتے ہی با آواز بلند سلام کیا۔ ''وعلیکم السلام''، امی کی نقاہت بھری آواز ابھری۔ انہیں تکلیف میں دیکھ کر میں بے چین ہوگیا۔ اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

''تم آج اُوپر والے کمرے میں سوجانا، میری وجہ سے تم بھی جاگتے رہتے ہو۔'' امی نے پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں امی! مجھے آپ کے بغیر کیسے نیند آئے گی۔ میری نیند کی آپ فکر مت کریں۔'' میں نے کہا۔

''ایک ہفتے سے تمھاری نیند پوری نہیں ہورہی ہے۔ مسلسل جاگنے سے تم خود بھی بیمار ہو جاؤ گے، تمہیں دفتر بھی جانا ہوتا ہے، میرے پاس شکیل بھائی موجود ہیں۔'' امی نے دوبارہ زور دیا تو ناچار میں اُوپر کمرے میں چلا آیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ مجھے امی کے بغیر سونے کی عادت نہیں تھی، میں روز رات کو امی پر قرآنی آیات پڑھ کر دم کرتا اور ان کے پاؤں دباتے دباتے ہی سوجاتا، مگر آج مجھے امی کے بغیر سونا تھا، یہ سوچ کر ہی میں افسردہ ہوگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ امی گذشتہ ایک ہفتے سے بے چینی کا شکار تھیں۔ وہ مختلف امراض کا بھی شکار تھیں مگر انھیں دیکھنے والا کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ تکلیف میں ہیں۔ ان کے لبوں پر ہمیشہ یہ دُعا ہوتی: ''یااللہ! تو جس حال میں رکھے، میں خوش ہوں۔''

میری یہ عادت تھی کہ روز دفتر سے واپسی پر امی کے پاس چلا جاتا، مجھے دیکھتے ہی وہ اپنی دُعاؤں سے نوازتیں۔ میں بستر پر لیٹا گہری سوچوں میں گم تھا۔ میں جانتا تھا کہ سہیل بھائی کی اچانک موت نے انھیں دُکھی کر دیا ہے، سہیل بھائی تھے بھی تو بہت اچھے، ابو کی موت کے بعد وہ امی کا سہارا بنے تھے، حالاں کہ وہ خود بھی اس وقت پانچویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھے مگر انھوں نے اپنے عزم و حوصلہ سے بڑوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ سندھ کے سیلاب سے متاثرہ شہر دادو میں اپنے دوستوں کے ساتھ سامان بانٹنے گئے تھے۔ وہاں لوگوں کی حالت دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے تھے۔ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے تھے، خصوصاً طالب علموں کی مدد کرنے کے لیے تو وہ اپنے آرام کا بھی خیال نہیں کرتے تھے۔ خود میں بھی اپنے امتحانات کے سلسلے میں انھیں ساری ساری رات جگائے رکھتا تھا۔ سہیل بھائی کو یاد کرتے ہی میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

☆☆☆

امی ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں۔ بچپن ان کا بہت اچھا گزرا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہمارے ابو کا انتقال ہو گیا تو امی گم صم سی ہو گئیں مگر پھر جلد ہی خود کو سنبھالا کیوں کہ اب انہیں ہی بچوں کی پرورش کرنا تھی۔ ابو کے بعد گھر میں کوئی کمانے والا نہ تھا۔ انھوں نے اپنی ہمت سے زندگی کی گاڑی کو آگے دھکیلنا شروع کیا۔ ہم بہن بھائیوں کی تعلیم، ان کی شادی، پھر میرا اور شکیل بھائی کا ایکسیڈنٹ اور مکان کی تعمیر، اللہ کے فضل سے امی نے سب محاذ کامیابی سے سر کیے۔ مگر سہیل بھائی کی اچانک موت نے سب کو افسردہ کر دیا تھا۔ امی کو تو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ ماضی کے بہت سے واقعات مجھے یاد آ رہے تھے۔

☆☆☆

”امی! آج میرا سکول جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔“

”ارے سکول نہیں جاؤ گے تو بڑے آدمی کیسے بنو گے۔“

امی کے چہرے پہ ناگواری کے اثرات نظر آ رہے تھے۔ مجبوراً میں منہ بسورتا ہوا ان کے ساتھ چل پڑا۔ میں سارے رستے روتا رہا، مگر امی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ سکول میں داخل ہوتے وقت امی نے اطمینان کر لیا کہ میں اپنی کلاس میں پہنچ چکا ہوں تو وہ گھر واپس چلی گئیں۔ میں سکول میں جا کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ جب میں نے اطمینان کر لیا کہ امی جا چکی ہوں گی تو باہر نکل آیا۔ سکول لگنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی، کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ میں نے آہستہ آہستہ گھر کی طرف قدم بڑھائے۔ کچھ دیر بعد میں اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ میں گھر میں داخل ہوا، تو امی صحن میں کام کر رہی تھیں، انھوں نے جیسے ہی مجھے دیکھا، تیزی سے میری طرف بڑھیں اور آگے بڑھ کر تھپڑ لگا دیا۔

”پڑھو گے نہیں تو بڑے آدمی کیسے بنو گے۔ پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے تمہارے ابو کا محلے بھر میں نام تھا اور تمہیں پڑھنے کا شوق ہی نہیں۔“ امی کا غصہ عروج پر تھا۔ اس روز وہ بیمار بھی تھیں، گرمی کا موسم تھا، اور سکول بھی دوپہر کا تھا۔ ”اپنی جنتاں کو تنگ کرتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے امی کے آنسو نکل آئے۔ میں جانتا تھا کہ یہ لفظ وہ بہت خاص مواقع پر بولتی تھیں۔ پھر امی مجھے دوبارہ سکول چھوڑنے گئیں۔

☆☆☆

اتوار کو میں دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا۔ میری نظریں صادق کی طرف تھیں جو مجھے گیند کرا رہا تھا، اچانک میری چیخ نکل گئی، میں گلی کی طرف مڑنے والے ٹرک کے پچھلے پہیوں کی زد میں آ چکا تھا، وہ مجھے کچلتا ہوا کافی دُور تک لے گیا تھا، صادق نے چیخ ماری تو ٹرک ڈرائیور نے بریک لگائی۔ میں خون میں لت پت تھا، اور حیرت سے خود کو دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیور مجھے دیکھ کر گھبرا گیا۔ میرے ایک پڑوسی جو اس وقت وہاں موجود تھے، جلدی سے ایک رکشہ لے آئے اور مجھے ہسپتال لے گئے۔

مجھے شام تک ہوش آ گیا تھا، میرے اِرد گرد کئی رشتہ دار بیٹھے ہوئے تھے، مجھے ان ہی کی زبانی پتہ چلا کہ شور سن کر امی بھی باہر نکل آئی تھیں، جب انھیں میرے بارے میں معلوم ہوا تو وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ یہ سنتے ہی میں نے رونا شروع کر دیا تھا کہ مجھے امی کے پاس لے چلو، اتنے میں ایک ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیا، پھر میں گہری نیند سو گیا۔ امی کو دو روز بعد ہوش آیا تھا، وہ ایک ہفتے تک ہسپتال میں داخل رہیں، آٹھویں روز جب میں سویا ہوا تھا تو مجھے اپنے چہرے پر کسی چیز کا لمس محسوس ہوا، اس لمس کو میں بخوبی محسوس کر سکتا تھا، ”امی!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”امی آپ ٹھیک تو ہیں ناں۔“

”ہاں۔“ انھوں نے سر ہلا دیا۔

امی روز ہسپتال آتیں، جب ان کے جانے کا وقت ہوتا تو میں انھیں کسی صورت جانے نہ دیتا۔ کبھی ان کا پرس چھپا دیتا تو کبھی تھرماس اور کبھی ٹوکری۔ اور امی ہر بار یہ وعدہ کرتیں کہ کل وہ مزید جلدی آ جائیں گی۔

ایک روز جب دس بج گئے اور امی نہ آئیں تو یاسین بھائی نے بتایا۔

”آج ہڑتال ہے، اور گاڑیاں بھی نہیں چل رہیں، ممکن ہے امی نہ آئیں۔“ یاسین بھائی نے اتنا کہا تو میری جان ہی نکل گئی،

میں نے رونا شروع کر دیا۔ جب ساڑھے دس بج گئے تو میں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ میں نے روتے روتے دروازے کی طرف دیکھا، امی ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے میری طرف آرہی تھیں۔ان کے ہاتھ میں ٹوکری اور چائے کا تھرماس تھا۔

امی نے مجھے روتے دیکھا تو چونک گئیں، ''ارے تم کیوں رو رہے ہو؟''میں نے کوئی جواب نہ دیا اور بدستور روتا رہا۔ ''دیکھو، اگر تم چپ نہ ہوئے تو تمھاری جتناں بھی رونے لگ جائے گی۔'' امی مجھے روتا دیکھ کر تڑپ اٹھی تھیں۔میں روتے روتے چپ ہو گیا۔

''امی! مجھے یاسین بھائی نے بتایا تھا کہ آپ ہڑتال کی وجہ سے نہیں آئیں گی۔''

''ارے پاگل، میرا بچہ ہسپتال میں تکلیف میں ہو تو میں گھر پرآرام سے کیسے رہ سکتی ہوں۔''امی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔میں ان کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا۔

میرے بستر کے ساتھ ہی کھڑکی تھی جہاں سے میں باہر کا منظر باآسانی دیکھ سکتا تھا۔دُور دُور تک سڑک سنسان تھی،سڑک پر نہ کوئی گاڑی تھی اور نہ ہی کوئی انسان۔

''امی! آج آپ کیسے آئی ہیں؟''

''جیسے روز آتی ہوں۔'' انھوں نے جواب دیا۔اچانک میری نظر امی کے پاؤں پر پڑی۔ان کے پاؤں گرد آلود تھے،چپل مٹی سے اٹی ہوئی تھی،امی کی چپل ایسی تو نہیں ہوتی، وہ تو صاف ستھری رہتی ہیں، پھر یہ مٹی کیسی۔میں یہی سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب معائنہ کے لیے آئے۔انھیں دیکھتے ہی میں خوف کے مارے چلّانے لگا۔ مجھے اس ڈاکٹر سے بڑا خوف آتا تھا یہ مجھے ورزش کرایا کرتے تھے، ورزش کے وقت امی مجھے چھوڑ کر باہر چلی جاتی تھیں۔

امی باہر گئیں تو یاسین بھائی میرے قریب آئے۔

''امی کو اتنا پریشان کیوں کرتے ہو،تمہیں پتا ہے کہ وہ کیسے آئی ہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔''وہ پیدل آئی ہیں اور تمھیں پتا ہے کہ ہمارا گھر کتنا دُور ہے۔وہ مسلسل تین گھنٹے پیدل چل کر یہاں آئی ہیں۔آج وہ نمازِ فجر پڑھ کر ہی گھر سے چل پڑی تھیں۔تمہارے لیے سوپ اور دوپہر کا کھانا بھی انھوں نے تیار کیا،شاید وہ آج رات سوئی نہیں، اتنے سامان کے ساتھ یہاں آنا کتنا مشکل ہے،کبھی تو سمجھ جایا کرو۔ماں ہو تو ایسی۔''یاسین بھائی کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملانے لگے تھے۔

''یاسین بھائی!میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ میں امی کے بغیر نہیں رہ سکتا''میں گھٹنوں میں سر دیے رو رہا تھا،اچانک مجھے اپنے چہرے پر کسی کا لمس محسوس ہوا تو میں نے سر اٹھایا۔ ورزش کرانے والے ڈاکٹر صاحب میرے سامنے موجود تھے۔ اس کے بھی آنسو نکل آئے تھے۔

''معین! نہ روؤ۔ مائیں سب کی سانجھی ہوتی ہیں، وہ جو قربانیاں ہمارے لیے دیتی ہیں، ہم اس کا حق بھی ادا نہیں کر سکتے، اس کے باوجود ہم انھیں تکلیف دیتے ہیں۔'' انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔''اچھا اب مزے سے ورزش کرو۔ جتنا اچھا تم میرا ساتھ دوگے ،اتنا ہی جلدی تم ہسپتال سے رخصت ہو کر گھر چلے جاؤ گے،اور تمھاری امی کو روز آنے جانے کی تکلیف بھی نہ ہوگی۔'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس دن کے بعد میری اس ڈاکٹر سے دوستی ہوگئی۔

مجھے امی کی قربانیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ امی مجھ سے کتنا پیار کرتی ہیں اور میں انھیں کتنا تنگ کرتا ہوں۔''اب میں امی کو کبھی تنگ نہیں کروں گا۔'' میں نے سوچا، مگر یہ باتیں میں سوچ کر فوراً بھلا دیتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ امی ہسپتال میں موجود رینجرز اور پولیس کے سپاہیوں کے لیے بھی کھانا لے کر آتی ہیں۔ایک دو بار ان سپاہیوں نے امی سے کھانا مانگا تو وہ ان کے لیے روز کھانا لانے لگیں،انھیں امی کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے بہت پسند تھے،اگر کوئی انھیں منع کرتا تو وہ کہتیں، یہ سپاہی اپنے گھروں سے دُور صرف ہماری حفاظت کے لیے یہاں آئے ہیں،تو کیا ہم ان کے لیے اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتے۔

میں تقریباً چار ماہ تک ہسپتال میں داخل رہا۔ ہسپتال سے رخصت ملنے کے بعد میں نے سکھ کا سانس لیا،ایک سال بعد میرا تعلیمی سلسلہ پھر سے شروع ہوا،آہستہ آہستہ میں زندگی کی رونقوں کی طرف پلٹ رہا تھا،ایک روز میں سکول میں تھا تو اچانک

فائرنگ شروع ہوگئی۔شہر کے حالات اکثر خراب رہنے لگے تھے۔ کلاس میں موجود بچے خوف کے مارے رونے لگے۔مس انھیں چپ کرانے میں لگ گئیں،تھوڑی دیر بعد بچوں کے والدین آنا شروع ہوئے اور وہ انھیں لے کر جانے لگے۔ حالات خراب ہونے کے باوجود امی جان مجھے سکول لینے کے لیے آئیں۔

☆☆☆

ایک روز امی نے مجھ سے کہا۔"معین !مجھے نیا جوڑا تو سلوا دو۔" میں نے جھٹ سے پیسے امی کو تھما دیے۔شام کو جب دفتر سے لوٹا تو امی نے طرح طرح کے مزے دار کھانے بنا رکھے تھے۔ میں کچھ دنوں سے ان کھانوں کی فرمائش کر رہا تھا مگر امی ٹال جاتیں۔کھانے کے بعد میں نے امی سے نئے جوڑے کا پوچھا تو انھوں نے کہا کہ پیسے تو میں نے خرچ کر دیے ہیں۔ میرا موڈ خراب ہوگیا اور میں اُوپر کمرے میں چلا آیا۔تھوڑی دیر بعد بہن نے بتایا کہ جو پیسے آپ نے امی جان کو دیئے تھے ان ہی پیسوں سے تو آج آپ نے مزے دار کھانے کھائے ہیں۔یہ سنتے ہی میں شرمندہ سا ہوگیا۔

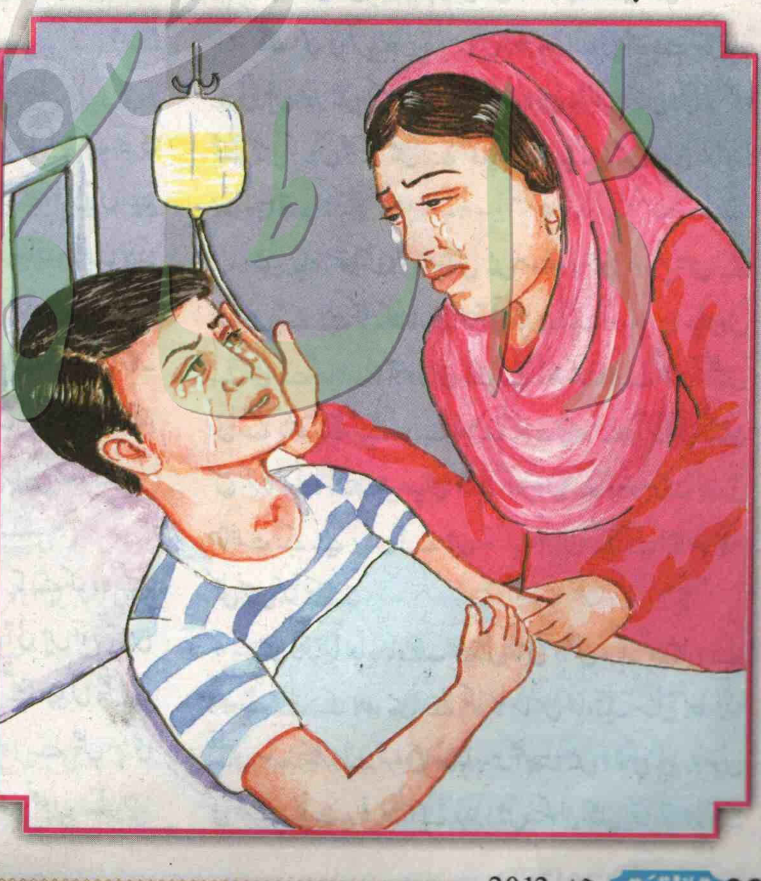
☆☆☆

برسات کا موسم تھا۔صبح سے ہونے والی بارش نے سارے گھر کو پانی سے بھر دیا تھا۔چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔ امی نے کپڑے لگا کر پانی روکنا چاہا مگر پانی سارے کمرے میں پھیل چکا تھا۔ اور اب یہ طے پایا تھا کہ ماموں کے گھر رات بسر کی جائے۔ امی ہر ممکن کوشش کرتی تھیں کہ اپنے گھر میں ہی سویا جائے۔

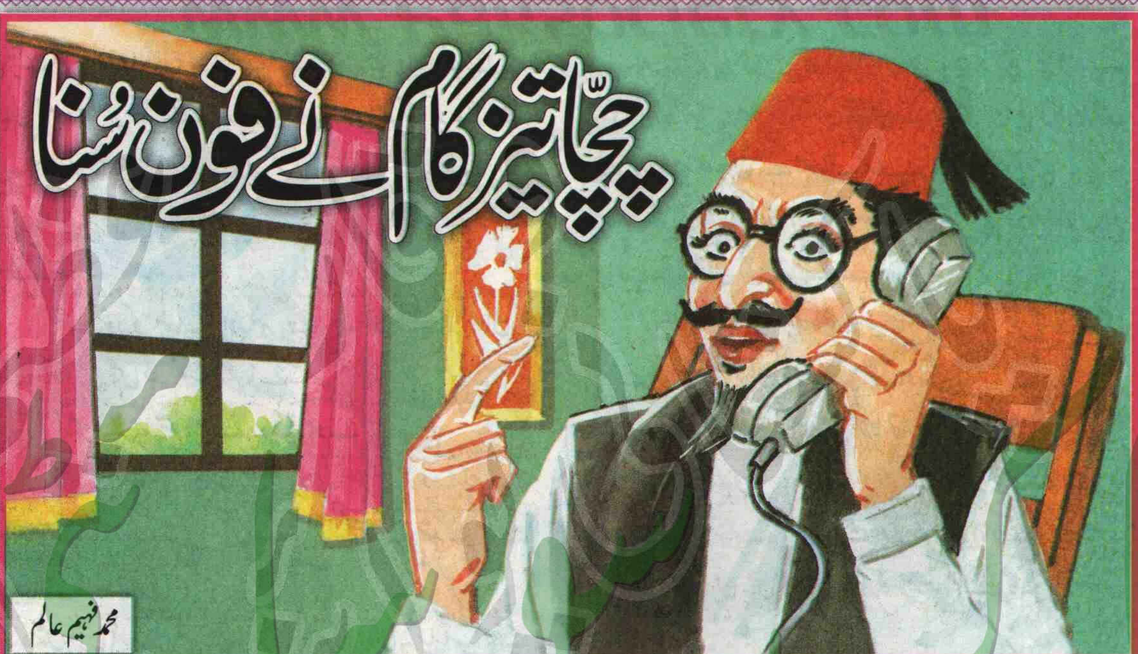
گھر بننے کے بعد امی کو اطمینان سا ہوگیا تھا کہ اب برسات میں چھت نہیں ٹپکے گی، مگر یہ اطمینان کچھ عرصے ہی رہا،طویل عرصے مشکلات کا مردانہ وار سامنا کرتے کرتے انہیں طرح طرح کی بیماریوں نے گھیر لیا تھا،مگر وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتیں۔

☆☆☆

بستر پر لیٹے لیٹے مجھے نیند نے آلیا تھا،ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ دروازہ بجنے کی آواز سنائی دی،دروازہ کھولا تو بھابھی کھڑی تھیں،امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ یہ سن کر میں فوراً نیچے اتر آیا۔ امی آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں، میں نے انھیں ہلانا چاہا مگر ان کا بلاوا آچکا تھا۔ ہماری جنتاں ہم کو روتا چھوڑ کر ہم سے رخصت ہو چکی تھی، کاش میں نے امی کو کبھی نہ ستایا ہوتا۔



امی کے جنازے میں ایک عورت کو دیکھ کر میری نظریں اس پر ٹھہر گئیں۔وہ زار و قطار رو رہی تھی ۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک غریب عورت تھی، اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا اور امی در پردہ اس کی مدد کرتی رہتی تھیں، اس جیسی کئی اور عورتوں کو میں جانتا تھا جن کی امی خاموشی سے مدد کیا کرتی تھیں۔اس عورت کو دیکھتے ہوئے میں نے ایک فیصلہ کیا ، میں امی کے مشن کو جاری رکھوں گا۔ یہ سبق میں نے اپنی جنتاں سے ہی سیکھا ہے، میں اپنی جنتاں کے مشن کو جاری رکھوں گا۔ واقعی ماں تو ایسی ہوتی ہے۔



چچا تیز گام نے فون سنا

محمد فہیم عالم

دوپہر کا وقت تھا۔ کچھ دیر پہلے چچا تیز گام دوپہر کا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ روزانہ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ ضرور کرتے تھے۔ آج بھی وہ اپنے معمول کے مطابق قیلولہ کرنے کے لیے بستر پر لیٹے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

”جمن...... او...... جمن...... استاد...... ارے کہاں مر گئے تم دونوں، فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی سن ہی نہیں رہا۔“ چچا تیز گام بستر پر لیٹے ہوئے چلاّئے۔

”جج...... جی...... مالک!“ ان کی آواز سن کر جمن اور استاد دونوں کمرے میں رکھے فون کی طرف دوڑے اور بیک وقت دونوں نے جھک کر فون کی طرف ہاتھ بڑھائے تو دونوں کے سر آپس میں بُری طرح ٹکرائے پھر دونوں اپنے سر پکڑ کر فرش پر بیٹھ گئے۔

چچا تیز گام فون کے مسلسل بجنے کے باعث پریشان تھے۔ وہ بار بار پوچھ رہے تھے کہ فون کس کا ہے۔ جمن اور استاد اپنے سر پکڑے بیٹھے تھے۔ فون کی آواز سن کر چچا تیز گام بستر سے اٹھ کر فون کی طرف بڑھے۔

”السلام علیکم!“ وہ ریسیور کان سے لگاتے ہوئے بولے۔

”وعلیکم السلام، کیا نواب صاحب گھر پر ہیں؟“ دُوسری طرف موجود شخص کوئی دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔

”نواب صاحب، کون سے نواب صاحب، یہاں تو کوئی نواب صاحب نہیں رہتے۔ یہاں تو بس ہم رہتے ہیں۔“ چچا تیز گام بولے۔

”تو کیا یہ نواب تنویر احمد صاحب کا گھر نہیں ہے؟“

”نواب تنویر احمد، ہم نواب تنویر احمد ہی بات کر رہے ہیں۔“ چچا تیز گام بارعب انداز میں بولے۔

”نواب صاحب! میں چوہدری شیر محمد کے گاؤں سے ان کا ملازم بالی بات کر رہا ہوں۔“ دُوسری طرف سے کہا گیا۔

”ہمارے دوست چوہدری صاحب کا کیا حال ہے؟“

”ایک منٹ نواب صاحب، ہولڈ کیجیے گا۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ شاید اسے کسی نے آواز دی تھی۔

”وہ تو مر گئے ہیں، جی نواب صاحب!“

”کیا!!!......“ اُس کا یہ جملہ سن کر چچا تیز گام چلاّ اٹھے۔ ریسیور ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

”محمود کے ابا کیا ہوا؟“ ان کے چلاّنے پر بیگم گھبرا کر دوڑی ہوئی آئیں۔

”بیگم!...... بیگم......! ہمارا پیارا دوست شیر محمد اس بھری دُنیا میں ہمیں تنہا چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ ہائے اب ہم کس کو دوست کہہ کر پکاریں گے۔“ یہ کہہ کر چچا تیز گام زمین پر بیٹھ کر زور زور سے رونے لگے۔

”اوہ، تو کیا بھائی شیر محمد انتقال کر گئے ہیں۔“ بیگم بولیں۔

”جی ہاں، ابھی گاؤں سے ان کے ملازم کا فون آیا تھا،

میرے دوست کا انتقال ہو گیا ہے، ہائے وہ کتنے پیار سے ہمیں ہر سال آم بھیجا کرتے تھے۔ اور ہمیں نواب تنویر احمد کہا کرتے تھے۔ ایک وہی تو تھے جو ہمیں نواب کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ہائے اب ہمیں نواب تنویر احمد کون کہا کرے گا۔'' چچا تیزگام نے روتے ہوئے کہا۔

''آپ خود کو سنبھالیے اور صبر کیجیے، اللہ تعالیٰ شیر محمد بھائی کو جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے۔''

''آمین۔'' چچا تیزگام نے روتے ہوئے کہا۔

''بیگم! تم جلدی سے ہماری شیروانی استری کر دو۔ ہم اپنے دوست کے جنازے میں جائیں گے۔'' یہ کہتے کہتے شدتِ غم سے ان کی ہچکی بندھ گئی۔

میں ابھی آپ کی شیروانی استری کر دیتی ہوں۔ کیا آپ اکیلے جائیں گے؟'' بیگم نے پوچھا۔

''گلو میاں اور پہلوان جی بھی ہمارے ساتھ جائیں گے، جمن جاؤ، تم دونوں کو بتا آؤ، اور ان سے کہنا ذرا جلدی آ جائیں۔'' چچا تیزگام بولے۔

گلو میاں اور پہلوان جی آئے تو چچا تیزگام پہلوان جی کے گلے لگ کر رونے لگے۔

''ہائے گلو...... ہمارا دوست ہمیں چھوڑ کر چلا گیا، ہم برباد ہو گئے، گلو ہم لٹ گئے۔''

چچا تیزگام کو روتا دیکھ کر دونوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ کیوں کہ چوہدری شیر محمد ان کے بھی دوست تھے۔ وہ بڑی محبت سے ان کے لیے گاؤں سے آم بھیجا کرتے تھے۔ چچا تیزگام کے گھر ہر سال جون میں ہونے والی آم پارٹی انہی کی مرہونِ منت تھی۔

''جنازہ کتنے بجے ہے؟'' گلو میاں نے پوچھا۔

''یہ تو میں نے نہیں پوچھا۔ اب وہ میرے بغیر تو میرے دوست کو نہیں دفنا سکتے۔ میں جاؤں گا تو جنازہ ہوگا۔'' چچا تیزگام بولے۔

''اگر ہم بس یا ٹرین سے گئے تو بہت دیر ہو جائے گی، کیوں نہ ہم شبراتی حلوائی سے ان کی وین کے بارے میں بات کر لیں۔ اُمید ہے وہ راضی ہو جائیں گے۔'' پہلوان جی نے تجویز پیش کی۔

''ہاں یہی ٹھیک رہے گا۔ چلو شبراتی کے پاس چلتے ہیں۔'' گلو میاں بولے۔

پھر تینوں شبراتی حلوائی کی دُکان پر پہنچے تو چچا تیزگام کے پڑوسی طیب الیاس اور عمر فاروق شبراتی کے ساتھ ان کی دُکان میں بیٹھے گرما گرم سموسوں سے انصاف کر رہے تھے۔

''شبراتی! چچا تیزگام کے دوست چوہدری شیر محمد کا انتقال ہو گیا ہے۔'' پہلوان جی بولے۔

''کیا!!!'' شبراتی چلّا اٹھا۔ طیب الیاس اور عمر فاروق بھی سموسے کھانا چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''وہی نا جو ہر سال آم بھیجا کرتا تھا۔''

''ہاں...... ہاں...... وہی...... ہم اس کے جنازے میں جا رہے ہیں۔ اگر تمہارے پاس وقت ہو تو تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ اگر ہم تمہاری وین میں جائیں گے تو وقت کم لگے گا۔'' گلو میاں نے کہا۔

''ہاں...... بھئی کیوں نہیں، تیزگام کا دوست ہمارا دوست ہے۔ ہم ضرور چلیں گے۔'' شبراتی بولا۔

''اور ہم بھی چلیں گے، چچا تیزگام ہمارے پڑوسی ہیں۔'' طیب الیاس اور عمر فاروق بھی بولے۔

کچھ دیر بعد وہ سب وین میں سوار شیر محمد کے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ مارے غم کے چچا تیزگام کی حالت بُری تھی۔ رو، رو کے ان کا بُرا حال تھا۔ انہیں شیر محمد کے گاؤں پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت ہو گیا تھا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' وہ شیر محمد کے گھر کے باہر پہنچے تو شبراتی بولا۔ چچا تیزگام کے بولنے سے قبل شیر محمد کے گھر سے ان کا بیٹا نکلا۔ چچا تیزگام شیر کی طرح اس کی طرف بانہیں پھیلائے لپکے۔

''ہائے میرا پیارا دوست مر گیا، میں اب کس کو دوست کہوں گا۔''

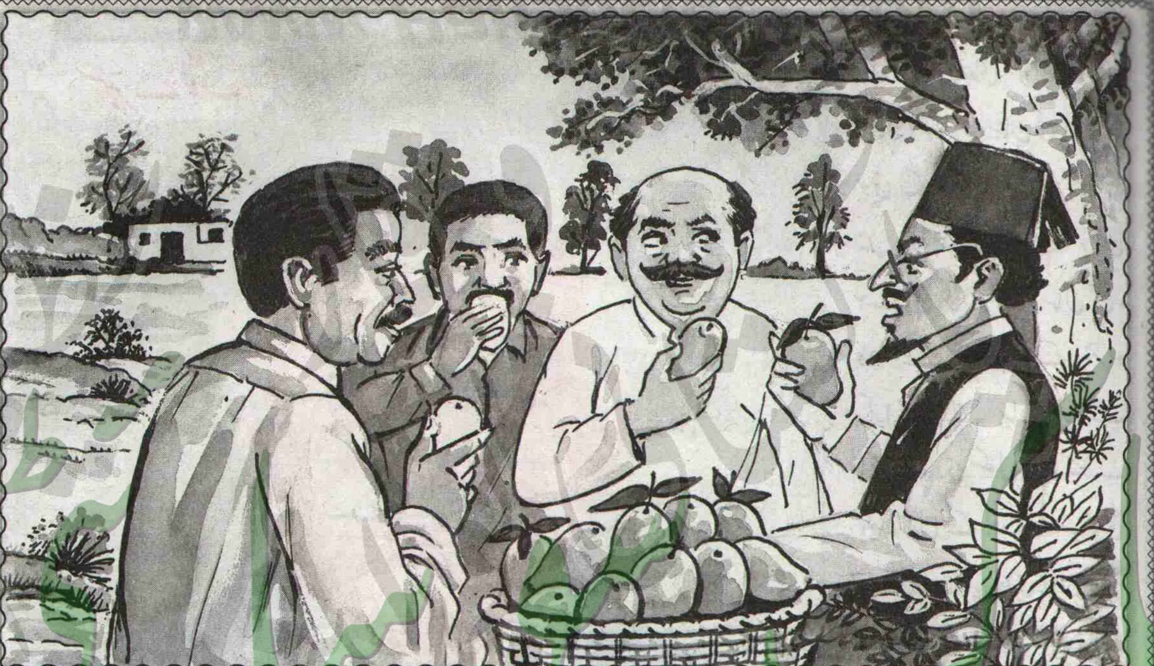
''آپ کس دوست کی بات کر رہے ہیں؟'' شیر محمد کے بیٹے حامد نے حیرت سے چچا تیزگام کو تکتے ہوئے سوال کیا۔

''میں اپنے دوست شیر محمد کی بات کر رہا ہوں۔''

''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میرے ابا جان......''

حامد نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ گھر سے شیر محمد نکل آیا۔

''ارے...... شیر محمد...... کیا تم زندہ ہو......'' چچا تیزگام حیرت سے بولے۔



"تو کیا مجھے مرا ہوا ہونا چاہیے تھا!"

"نہیں...... لیکن...... لیکن...... ہمیں تو یہی فون موصول ہوا تھا کہ تم مر گئے ہو۔" چچا تیز گام بولے۔

"کیا!...... یہ فون تمہیں کس نے کیا تھا، حامد، بالی کو بلا کر لاؤ۔" شیر محمد بولا۔

"آپ لوگ اندر آ جایئے۔" پھر وہ شیر محمد کے ساتھ ان کی بیٹھک میں آ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد حامد بالی کو لے کر آ گیا۔

"بالی! تم نے انہیں فون کیا تھا؟" شیر محمد نے پوچھا۔

"جی ہاں...... چوہدری صاحب! آپ نے ہی تو کہا تھا انہیں فون کرنے کو......" بالی بولا۔

"لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم میرے مرنے کی اطلاع دو۔" شیر محمد نے بالی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"لیکن چوہدری صاحب میں نے ان کو ایسی کوئی اطلاع نہیں دی۔"

"کیا کہا، توبہ ہے کیا زمانہ آ گیا ہے۔ لوگ کس دھڑلے سے جھوٹ بولتے ہیں۔ جب میں نے پوچھا تھا کہ ہمارے دوست چوہدری شیر محمد کا کیا حال ہے، تو تم نے کہا تھا وہ تو مر گئے ہیں۔" چچا تیز گام نے کہا۔

"اوہ...... تو یہ بات ہے، چوہدری صاحب، اصل میں نواب صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے، ہوا یہ تھا کہ میں انہیں فون کر ہی رہا تھا کہ حامد نے اسی دوران مجھے آواز دی تو میں نواب صاحب کو فون ہولڈ کروا کر حامد کی بات سننے لگا۔ حامد مجھ سے آم کے درختوں کے پتوں پر موجود کیڑوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ سپرے کرنے سے وہ مر گئے ہیں یا نہیں، تو وہ مر گئے ہیں میں نے ان کیڑوں کے بارے میں کہا تھا۔ نواب صاحب نے میری اگلی بات سنی ہی نہیں اور جھٹ فون بند کر دیا۔" بالی تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔

"اگر یہ ایسا نہ کریں تو انہیں چچا تیز گام کون کہے گا۔" پہلوان جی بُرا سا منہ بنا کر بولے۔ سب کو اس وقت چچا تیز گام پر بہت غصہ آ رہا تھا۔

"ویسے بھئی شیر محمد تم ہمیں فون کیوں کروا رہے تھے؟" چچا تیز گام نے پوچھا۔

"لو بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بھئی...... آم پک چکے ہیں، ہم نے سوچا اس مرتبہ آم بھیجنے کی بجائے تمہیں اور تمہارے دوستوں کو یہیں بلا کر آم پارٹی کی جائے۔" شیر محمد کی بات سن کر چچا تیز گام بولے۔

"واہ...... بھئی...... واہ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

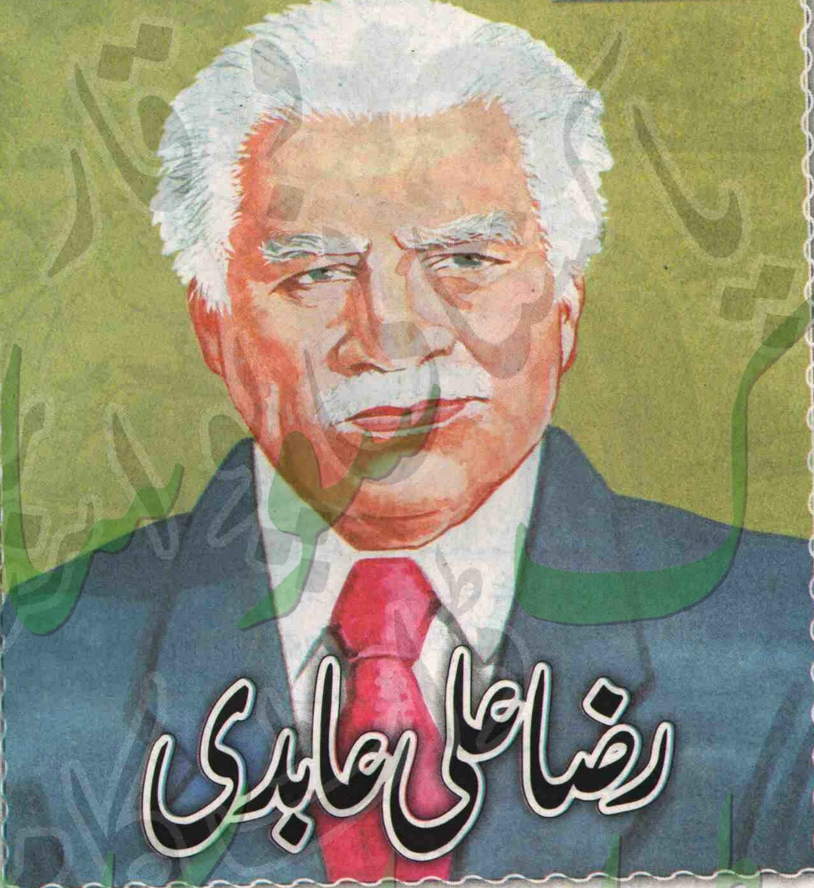
"ہاں اسی لیے تو میں نے فون کروایا تھا۔" شیر محمد نے کہا۔

"تو ہم نے اپنے دوستوں کو ساتھ لا کر اچھا ہی کیا ہے۔" چچا تیز گام نے مسکرا کر کہا۔

کچھ دیر بعد سب شیر محمد کے آموں کے باغ میں بیٹھے موٹے موٹے، پیلے پیلے اور رس بھرے آموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

سنہرے لوگ

غلام حسین میمن



رضا علی عابدی

ریڈیو پاکستان کے پروگراموں کو سامعین ہمیشہ بہت ذوق وشوق سے سنتے آئے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے علاوہ سامعین کی ایک بڑی تعداد خبروں کے لیے بی بی سی (برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن) لندن سنتی تھی۔ عموماً رات ساڑھے آٹھ بجے سے پونے نو بجے تک بین الاقوامی خبروں کے بعد روزانہ پندرہ منٹ کا کوئی نہ کوئی ہفتہ وار پروگرام بھی نشر ہوتا تھا۔ انجمن خطوں کے جوابات پر مبنی پروگرام تھا۔ ''شاہین کلب'' بچوں کے لیے پروگرام تھا جس میں ایک کردار ''سدھو بھائی'' آج تک سننے والوں کو نہیں بھولا۔ یہ بھولا بھالا کردار اپنی باتوں سے پروگرام سننے والے بچوں کو بے حد ہنساتا تھا۔ اس پروگرام کو مقبول بنانے میں اس کے پروڈیوسر رضا علی عابدی کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے ریڈیو پر کئی اور بڑے کام بھی کیے جو تاریخ کا حوالہ بن گئے ہیں۔

رضا علی عابدی 30 نومبر 1936ء کو ہندوستان کی ریاست یوپی کے چھوٹے سے شہر روڑ کی میں پیدا ہوئے۔ 1950ء میں جب ان کی عمر 14 سال تھی، وہ اپنے خاندان کے ہمراہ کراچی آ گئے۔ بہادر یار جنگ ہائیر سیکنڈری سکول سے میٹرک کیا۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج سے بی اے کیا۔ اسی دوران قلم سے رشتہ مضبوط ہوا۔ ادبی زندگی کا آغاز اخبارات کے بچوں کے صفحات میں لکھنے سے ہوا۔ پھر ایک مقبول روزنامے میں ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ انہیں کئی نام ور لوگوں کے ساتھ کام کرنے اور سیکھنے کا موقع ملا جن میں شوکت صدیقی بھی شامل ہیں۔ شوکت صدیقی کا ایک مضبوط حوالہ ان کا لکھا ہوا ٹی وی کا مقبول ڈرامہ سیریل ''خدا کی بستی'' ہے جو کئی بار پی ٹی وی سے نشر ہو چکا ہے۔

اسی دوران انہیں معروف صحافی فخر ماتری روزنامہ حریت میں لے آئے۔ حریت میں کام کے دوران انہیں تین ماہ کے لیے صحافیوں کے کورس کے لیے لندن جانے کا موقع ملا۔ جب وہ کراچی واپس آئے تو وہ لندن میں رہنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ وہاں ریڈیو بی بی سی لندن ایک معروف ادارہ ہے۔ اس میں ملازمت حاصل کرنے کے لیے کوششیں شروع کیں۔ اخبار ہی کے ایک پرانے ساتھی کی معرفت مراحل طے ہوئے اور بالآخر وہ اس بڑے نشریاتی ادارے کے لیے منتخب کر لیے گئے۔ انہوں نے لندن جانے میں ذرا بھی تاخیر نہ کی۔ شروع میں خطوں کا پروگرام ''انجمن'' اور

بچوں کا پروگرام ''شاہین کلب'' پیش کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہی بی بی سی لندن، رضا علی عابدی کی اصلی شہرت کا سبب بنا۔ یہاں انہیں کئی ایسے معلوماتی پروگرام پیش کرنے کی ذمہ داری دی گئی جنہوں نے بے حد مقبولیت پائی اور بعد میں وہ پروگرام کتابی شکل میں بھی شائع کیے گئے۔

رضا علی عابدی کو بی بی سی لندن میں کام کرنے کے دوران خیال آیا کہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود برصغیر کی پرانی اور نایاب کتابوں کے بارے میں پروگرام کیا جائے۔ لندن کے اس مشہور کتب خانے میں برصغیر کا کافی کتابی ذخیرہ موجود ہے۔ کتابوں کے علاوہ نوادرات کا بھی ذخیرہ ہے۔

انڈیا آفس لائبریری میں موجود نادر و نایاب کتابوں کا تعارف انہوں نے ''کتب خانہ'' کے نام سے پیش کیا۔ اس پروگرام نے بے حد مقبولیت پائی۔ اس کے آخری پروگرام میں مشہور شاعر اور سفرنامہ نگار ابنِ انشاء بھی شریک ہوئے تھے۔ سامعین کے بے حد اصرار پر یہ پروگرام دوبارہ شروع کیا گیا، اس بار اس میں برصغیر (پاکستان اور ہندوستان) میں موجود مشہور اور نایاب کتابوں کے ذخیروں کا حال تھا۔ مثلاً وہ کتابیں کہاں اور کس حال میں ہیں...... اور یہ کہ کس کے پاس ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے دونوں ممالک کے کئی شہروں کا سفر کیا۔ یہ 1982ء کا سال تھا۔ اس پروگرام نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ بعد میں اس سلسلے کو کتابی شکل میں بھی پیش کیا گیا۔

ان دنوں بی بی سی اُردو سروس کے انچارج ڈیوڈ پیج تھے جنہوں نے عابدی صاحب سے کئی شاہکار پروگرام کروائے۔ ایک دن وہ عابدی صاحب سے کہنے لگے۔

''تم شیر شاہ سوری کو جانتے ہو......؟ اس نے کیا مشہور کام کیا تھا؟''

عابدی صاحب نے جواب دیا: ''وہ عظیم جرنیل تھا۔ اس نے پشاور سے کلکتہ تک سڑک بنوائی تھی۔ یہ سڑک جرنیلی سڑک کہلاتی ہے۔'' حکم ہوا: ''اس سفر پر نکل جاؤ اور ایک سلسلہ تحریر کرو۔''

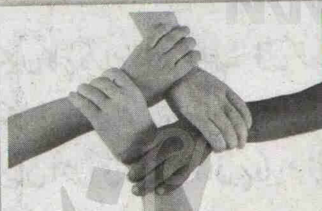
کسی شاہراہ پر نکل کر اس پر پروگرام کرنا ایک منفرد خیال تھا۔ عابدی صاحب اس سفر پر نکلے اور راستے میں آنے والے جو مقامات دیکھے، ان کے بارے میں لکھا۔ لوگوں سے ملے اور ان کے تاثرات ریکارڈ کیے۔ یہ معلوماتی سلسلہ جب بی بی سی لندن کے توسط سے ہواؤں کے دوش پر بکھرا تو سننے والوں میں بے حد مقبول ہوا۔ یہ سلسلہ بعد میں اسی نام سے انڈیا اور پاکستان سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔

ابھی یہ پروگرام سننے والوں کی یادداشت میں محفوظ تھا کہ ایک بار پھر عابدی صاحب اپنے باس کے حکم پر سفر پر نکلے۔ اس بار دریائے سندھ کے کنارے کنارے چلنا تھا۔ اس سفر کے دوران وہ اپنے سامعین کو راستے میں آنے والے ہر مقام کے بارے میں معلومات دیتے، لوگوں کے حالات اور رہن سہن بتاتے ہوئے چلنے لگے۔ یہ سفر لداخ کے مقام سے شروع ہوا جہاں دریائے سندھ ایک چھوٹا سا نالہ لگتا ہے۔ یہ سلسلہ وار پروگرام بھی سامعین کو مفید معلومات اور تفریح دینے کا ذریعہ بنا۔ یہ سلسلہ بھی کتابی شکل میں شائع ہو کر کتب خانوں کی زینت بنا۔

اس سفر کی تھکن کے آثار ابھی موجود تھے کہ پھر حکم ہوا کہ اِس بار ریل کا سفر کیا جائے اور دورانِ سفر کے حالات و واقعات سے سامعین کو آگاہ کیا جائے۔ یوں یہ سفر بھی پروگرام کی شکل میں ڈھل کر مقبولیت حاصل کر گیا۔ اس سلسلے پر مبنی بعد میں ''ریل کہانی'' کے نام سے ایک کتاب بھی شائع ہوئی۔

اس کے علاوہ انہوں نے برطانیہ میں اُردو سیکھنے کے خواہش مند طالب علموں کے لیے ایک قاعدہ بھی مرتب کیا۔ ایک کتاب اُردو کا حال بھی لکھی۔ رضا علی عابدی نے بچوں کے لیے بھی کئی کتابیں لکھیں۔ وہ 1996ء میں بی بی سی سے سبک دوش ہوئے۔ بی بی سی پر کام کے دوران انہوں نے وہ شہرت اور عزت پائی جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ اس شہرت اور عزت کے پیچھے ان کی بے پناہ محنت اور لگن کا دخل تھا۔ انہوں نے جو بھی کام کیا، پوری توجہ اور دل جمعی کے ساتھ کیا اور اسے انفرادیت عطا کی۔ اسی انفرادیت اور کام کی لگن نے انہیں نام ور بنا دیا۔

☆......☆......☆



آئیے عہد کریں

سمیر سکول سے آیا تو بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔ امی جان نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا: ''کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے اس لیے ضروری ہیں کہ جراثیم سے بچا جا سکے، جو بچے ایسا نہیں کرتے وہ جراثیم کے باعث مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں، اس لیے جب بھی کھانا کھاؤ پہلے اچھی طرح ہاتھ دھولو۔'' یہ سن کر سمیر ہاتھ دھونے لگا۔ سمیر کی طرح آپ بھی کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھولیا کریں تاکہ جراثیم آپ کو بیمار نہ کرسکیں۔ جو بچے ایسا کرنے کا عہد کرتے ہیں اُن کے نام اگلے مہینے شائع کیے جائیں گے۔ اس عہد نامے میں شامل ہونے کے لیے کوپن ارسال کرنا ضروری ہے۔



شاباش

ان بچوں نے عہد کیا کہ وہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ باہم محبت سے رہیں گے۔

محمد حارث بھٹہ، ملتان۔ ثقلین الیاس، پھول نگر۔ اریب احمد، ٹیکسلا۔ حافظ عمار واجد، ملتان۔ حمیرا بی بی، کشمور۔ محمد فیضان شکیل، قصور۔ اسماء قریشی، ملتان۔ منیر احمد شاہین، کشمور۔ معاذ احمد، لاہور۔ سید علی مجتبیٰ، گجرات۔ حمزہ افتخار، گوجرانوالہ۔ ربیعہ خالد، لاہور۔ عبدالسمیع، فیصل آباد۔ صحبا یوسف، حمنہ ثاقب، لاہور۔ نمرہ رمضان، فیصل آباد۔ طلحہٰ خلیل، سعد خلیل، مریم، ملتان۔ اشہد ایان، دریا خان، محمد مجتبیٰ، ملتان۔ نشاء رمضان، فیصل آباد۔ محمد رمضان شیخ، کشمور۔ محمد حذیفہ انوار، جھنگ۔ زرناب جمال، گوجرانوالہ۔ علی احسان، لاہور۔ رابعہ وسیم، طوبیٰ عارف، سیال کوٹ۔ غلام نبی نوری، کھڈیاں خاص۔ مریم بتول، لاہور۔ شارق، نوشہرہ۔ سیدہ سکینہ قریشی، ملتان۔ محمد حسن رضا، جوہر آباد۔ ام ایمن یوسف زئی، ٹیکسلا۔ محمد فیاض الحسن، تلہ گنگ۔ طارم نعیم راؤ، ساہی وال۔ خنساء اشرف، لاہور۔ معاذ احمد صدیقی، کندیاں۔ ملک علی حسن، چکوال۔ محمد ضیاء اللہ، میاں والی۔ نعمان صمریز، راول پنڈی۔ مریم حمید، گوجرانوالہ۔ حسن نوید، راول پنڈی۔ تحریم آرش مستطنیرہ، بہاول پور۔ عقیلہ عمار، لاہور۔ محمد حذیفہ، دینہ۔ ماریہ وسیم، کراچی۔ معظّمہ کفایت، ساہی والا۔ محمد ہاشم چکسواری۔ حبیبہ اسحاق، واہ کینٹ۔ محمد ابوذر، رحیم یار خان۔ ماہ نور آصف، ساہی وال۔ فہد علی، کراچی۔ ماجد نواز، کوئٹہ۔ رجا سہیل، پشاور۔

آئیے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 جون 2012ء ہے۔

نام ____________ مقام ____________

میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ ____________

____

____



پاکستان کرکٹ ٹیم پر نظر ڈالیں تو ہمیں بے شمار ایسے بولرز ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی عمدہ پرفارمنس سے پاکستان کو فتح سے ہم کنار کیا، فاسٹ بولرز نے جہاں اپنی کارکردگی سے پاکستان مخالف ٹیموں کو زیر کیا وہیں اسپن بولرز کی جانب دیکھیں تو بعض میچ اسپنرز بولرز کی بدولت ہی فتح یاب ہوئے ہیں۔ پاکستانی ٹیم میں اسپنرز بولرز کی کبھی کمی نہیں رہی ہر دور میں اسپنرز بولرز پاکستان کرکٹ ٹیم کا حصہ رہے ہیں۔ یہاں ہم پاکستان کے پانچ مایہ ناز اسپنرز بولرز کی کارکردگی پر ایک نظر ڈال رہے ہیں۔

اقبال قاسم

ان کا اصل نام محمد اقبال ہے۔ آپ نے اگست 1953ء کو کراچی کے ایک میمن خاندان میں آنکھ کھولی، ان کے والد قاسم علی محمد کاروباری آدمی تھے۔ اقبال قاسم کا بچپن ٹینس بال سے کرکٹ کھیلتے ہوئے گزرا۔ انٹر کالجیٹ کرکٹ میں بھی اقبال قاسم کا کھیل نمایاں رہا، بعد میں کلب جوائن کیا تو یہی ان کے کیریئر کا سنگ میل ثابت ہوا۔ آخر ان کی محنت رنگ لائی اور 77-1976ء میں آسٹریلیا میں ایڈیلیڈ کے مقام پر انہیں ٹیسٹ کیپ مل گئی۔ اس میچ کی پہلی اننگ میں یہ کوئی وکٹ حاصل نہ کر سکے تاہم دُوسری اننگ میں 30 اوورز میں 84 رنز دے کر 4 وکٹیں حاصل کیں اور آسٹریلیا کی یقینی فتح کو ڈرا میں بدل دیا۔ اس کارنامے پر آسٹریلوی اخبارات نے اس نئے بولر کی خوب مدح سرائی کی اور پھر یہ سلسلہ رکا نہیں۔ بنگلور ٹیسٹ عمران خان کی قیادت میں کھیلا، اس میچ کی دونوں اننگز میں مجموعی طور پر 9 وکٹیں حاصل کیں جس کی وجہ سے پاکستان یہ میچ جیتنے میں کامیاب رہا۔ اس میچ میں اقبال قاسم نے گواسکر کو 96 کے سکور پر آؤٹ کیا اور یوں پاکستان پہلی بار بھارت کو اس کی سرزمین پر ہرانے میں کامیاب ہوا۔ 12 سالہ انٹرنیشنل کرکٹ کیریئر کے دوران اقبال قاسم نے 50 ٹیسٹ کھیلے۔ ان میچوں میں انہوں نے بطور لیفٹ آرم اسپنر 28.11 کی اوسط سے 171 وکٹیں حاصل کیں۔ ان کی بہترین بولنگ نیشنل اسٹیڈیم کراچی میں آسٹریلیا کے خلاف 49 رنز دے کر 7 وکٹیں حاصل کرنا ہے۔ انہوں نے ٹیسٹ کرکٹ میں پانچ وکٹیں لینے کا کارنامہ 8 مرتبہ، جب کہ دو مرتبہ میچ میں دس وکٹیں حاصل کیں۔ 1976ء میں آسٹریلیا کے خلاف انہوں نے ٹیسٹ کرکٹ کا آغاز کیا اور آخری ٹیسٹ لاہور میں آسٹریلیا ہی کے خلاف 1989ء میں کھیلا۔ ٹیسٹ کرکٹ کے دوران اقبال قاسم نے ایک نصف سنچری سکور کی اور 13.07 کی اوسط سے 549 رنز بنائے۔

ایک روزہ انٹرنیشنل میچوں میں انہوں نے اپنا پہلا میچ 78-1977 میں انگلینڈ کے خلاف سیال کوٹ میں کھیلا۔ کُل 15 ایک روزہ بین الاقوامی میچوں میں انہوں نے 41.66 کی اوسط سے 12 وکٹیں حاصل کیں۔ ایک روزہ میچوں میں ان کی بہترین بولنگ 13 رنز دے کر 3 وکٹوں کا حصول تھا۔ انہوں نے فرسٹ کلاس کرکٹ کیریئر کا آغاز 71-1970ء میں کیا اور 999 وکٹیں حاصل کیں۔

توصیف احمد

10 مئی 1958ء کو کراچی میں پیدا ہونے والے توصیف احمد نے سکول کی سطح پر کرکٹ کا آغاز کیا۔ اس دور میں وہ درمیانی رفتار سے گیند کرنے والے ایسے میڈیم پیسر تھے، جس کی گیند پچ پر پڑنے کے بعد گھومتی تھی۔ بعدازاں وہ مکمل طور پر آف بریک بولر کے روپ میں ڈھل گئے لیکن تیز رفتاری ایکشن کی حد تک قائم رہی۔ سیدھے ہاتھ کے اس آف بریک بولر نے 1980ء میں پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا جو ان کی زندگی کا پہلا فرسٹ کلاس میچ بھی تھا۔ 1980ء سے 1993ء تک کے درمیانی عرصے میں پاکستان کی نمائندگی کی اور 34 ٹیسٹ میچز میں 93 وکٹیں لیں۔ جب کہ 70 ون ڈے میچز میں 55 وکٹیں حاصل کیں۔ کیریئر کا پہلا ون ڈے میچ سری لنکا کے خلاف کراچی میں کھیلا۔ آخری ون ڈے میچ 1990ء میں آسٹریلیا کے خلاف کھیلا اور آخری ٹیسٹ میچ 93ء میں زمبابوے کے خلاف کھیلا۔

عبدالقادر

80ء کی دہائی میں جب اسپن بولنگ کا فن دم توڑ رہا تھا، اس وقت پاکستان کے ایک جادوگر بولر نے اسے سہارا دیا۔ اسپن بولنگ کے یہ جادوگر عبدالقادر ہیں جن کی گگلی، فلیپر اور لیگ بریک گیندیں آج بھی شائقین کرکٹ کے ذہنوں پر نقش ہیں۔ رن اپ میں مخصوص رقص کا انداز لیے بولنگ کرنے والے عبدالقادر نے ابتدائی کرکٹ حبیب بینک کی طرف سے کھیلی اور پھر قومی ٹیم تک پہنچے۔

14 دسمبر 1977ء میں لاہور میں انگلینڈ کے خلاف اپنا پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا جب کہ 11 جون 1978ء کو برمنگھم کے مقام پر نیوزی لینڈ کے خلاف ون ڈے کیپ حاصل کی۔ عبدالقادر کا سنہری دور عمران خان کی قیادت میں شروع ہوا۔ کئی ایسے مواقع آئے جب فاسٹ بولروں کو وکٹ نہیں مل رہی تھی تو عبدالقادر کو لمبا اسپیل بھی کرنا پڑا۔ اپنے ٹیسٹ کیرئیر کے دوران 67 میچوں میں 23.76 کی اوسط سے 236 وکٹیں حاصل کیں۔ بہترین بولنگ 56 رنز کے عوض 9 وکٹیں انگلینڈ کے خلاف حاصل کیں جب کہ ایک میچ میں 101 رنز کے عوض 13 وکٹیں حاصل کر رکھی ہیں۔ انگلینڈ کے خلاف اس سیریز کے اختتام پر انگلش کپتان نے کہا تھا کہ آنے والے لیگ اسپن بولر اگر عبدالقادر کی بولنگ کے گرد کو بھی پالیں تو بڑی بات ہوگی۔ جہاں عبدالقادر نے اپنی جادوئی لیگ بریک بولنگ کے ساتھ بلے بازوں کا پویلین آنا جانا جاری رکھا۔ وہاں اپنے بیٹ کے ساتھ بھی کئی میچوں میں پاکستان کی جیت میں اہم کردار ادا کیا۔ چاہے ویسٹ انڈیز کے خلاف ورلڈ کپ 87ء کے میچ میں تین گیندوں پر دس رنز بنانے ہوں یا وکٹ پر رک کر میچ ڈرا کرنا ہو، عبدالقادر ہمیشہ سودمند ثابت ہوئے۔ انہوں نے 67 ٹیسٹ میچوں میں 1069 رنز، 61 کے بہترین سکور کے ساتھ بنائے۔ انہوں نے 104 ون ڈے میچوں میں 132 وکٹیں حاصل کیں، بہترین بولنگ 44 رنز کے عوض 5 وکٹیں ہیں۔

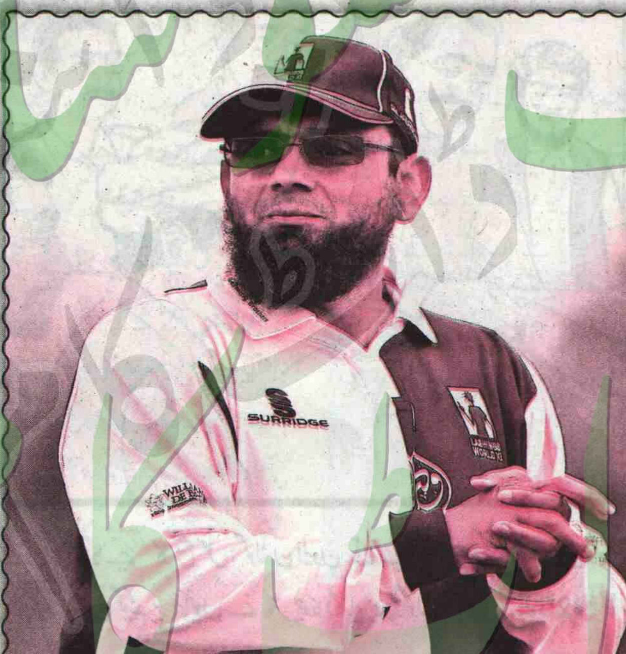
مشتاق احمد

28 جون 1970ء کو ساہی وال میں پیدا ہونے والے مشتاق احمد 1992ء کے ورلڈ کپ میں کامیابی حاصل کرنے والی ٹیم کا صرف حصہ ہی نہیں تھے بلکہ اہم میچوں میں ٹیم کی کامیابی میں انہوں نے کلیدی کردار بھی ادا کیا تھا۔ 1996ء میں انگلینڈ کو اس کی سرزمین پر ہرانے والے پاکستانی ٹیم کا بھی یہ حصہ تھے۔ 1995ء میں دو ٹیسٹ میچوں میں آسٹریلیا کی سرزمین پر اٹھارہ وکٹیں حاصل کرنا بھی ان کی یادگار پرفارمنس ہے۔ 1998ء میں جنوبی افریقہ کو پاکستان نے پہلی بار ٹیسٹ میں شکست دی تو میچ کے بہترین کھلاڑی کا اعزاز مشتاق کے حصے میں آیا۔ 52 ٹیسٹ میچوں میں 185 وکٹیں لینے والا یہ لیگ اسپنر کاؤنٹی کرکٹ میں بھی طویل عرصے تک شان دار کارکردگی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ سکس کاؤنٹی

2003ء میں پہلی بار کاؤنٹی چیمپئن بنی تو اس میں بنیادی کردار مشتاق احمد نے ادا کیا۔ دو بار مزید بھی مشتاق نے سکس کو کاؤنٹی چیمپئن بنوایا۔ 2003ء میں انٹرنیشنل کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنے لیے کوچنگ کا میدان منتخب کیا۔ وہ پاکستان کے اسسٹنٹ کوچ رہے، 2008ء میں کاؤنٹی کرکٹ چھوڑنے کے بعد وہ انگلینڈ کی ٹیم کے اسپن بولنگ کوچ کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ثقلین مشتاق

ثقلین مشتاق 29 دسمبر 1976ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اپنے بھائیوں سبطین اور ذوالقرنین کے ساتھ کرکٹ کے کھیل سے آشنائی ہوئی۔ ابتداء میں ظریف میموریل کلب اور بعد میں ایم اے او کالج کے پلیٹ فارم سے ان کا قومی کرکٹ ٹیم کی طرف سفر شروع ہوا۔ 1994ء میں 17 سال کی عمر میں فرسٹ کلاس کرکٹ کا آغاز کیا اور پہلے ہی سیزن میں 52 وکٹیں حاصل کر کے سلیکٹرز کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس سے پہلے وہ مسلسل تین سال تک ایم اے او کالج کو چیمپئن بنانے میں اپنا اہم کردار ادا کر چکے تھے۔ فرسٹ کلاس کے پہلے اور دُوسرے سیزن میں اعلیٰ کارکردگی سے سلیکٹرز متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جب سری لنکا کی ٹیم نے پاکستان کا دورہ کیا تو 8 دسمبر 1995ء کو پشاور میں ثقلین کو ٹیسٹ کیپ دی گئی۔ ثقلین مشتاق نے اپنے پہلے ٹیسٹ کی پہلی اور دُوسری اننگز میں دو، دو وکٹیں حاصل کیں۔ ثقلین مشتاق نے دو ٹیسٹ میچز میں 29.44 کی اوسط سے 9 وکٹیں حاصل کر کے بین الاقوامی کرکٹ میں اپنی آمد کا اعلان کر دیا۔ 29 دسمبر 1995ء میں گوجرانوالہ میں سری لنکا کے خلاف ون ڈے کیپ دی گئی۔ ثقلین مشتاق کا کرکٹ کیریئر بہت مختصر رہا انہوں نے ستمبر 95ء سے مارچ 2004 تک 49 ٹیسٹ میچوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ ٹیسٹ میچوں میں 14.48 کی اوسط سے 927 رنز بنائے۔ 101 ناٹ آؤٹ بہترین سکور رہا، ایک سنچری اور دو نصف سنچریاں اس میں شامل ہیں۔ بولنگ میں 14070 گیندیں پھینکیں۔ 6206 رنز دے کر 208 وکٹیں حاصل کیں۔ ایک اننگ میں 164 رنز دے کر 8 وکٹیں اور میچ میں 155 رنز دے کر 10 وکٹیں حاصل کرنا



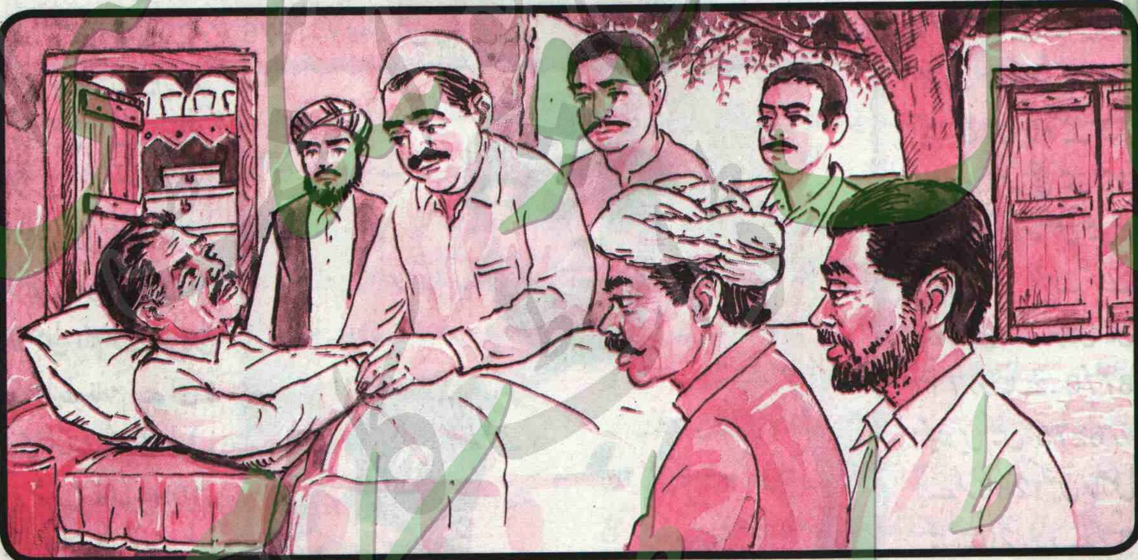
بہترین کارکردگی رہی۔ ایک میچ میں 5 وکٹیں 13 مرتبہ اور ایک میچ میں 10 وکٹیں تین بار حاصل کیں۔ پاکستان کی طرف سے 169 ون ڈے میچوں میں 711 رنز بنائے۔ 8770 گیندیں کیں، 6275 رنز دے کر 288 وکٹیں حاصل کیں۔ 20 رنز دے کر 5 وکٹیں بہترین کارکردگی رہی۔ ٹیسٹ کیریئر کے دوران 82 چوکے اور 7 چھکے لگائے۔ ون ڈے میں 45 چوکے، 4 چھکے لگائے۔ آپ سرے کاؤنٹی سے طویل عرصے تک کھیلتے رہے۔ 2000ء میں ثقلین مشتاق کی عمدہ پرفارمنس کی وجہ سے وزڈن نے انہیں سال کے بہترین کھلاڑی کا خطاب دیا تھا۔ 2003ء میں وزڈن کے اعداد وشمار کے مطابق ثقلین مشتاق اس وقت کے نمبرون اسپنر قرار پائے تھے۔ ان دنوں ثقلین مشتاق لندن میں مستقل رہائش پذیر ہیں۔

☆......☆......☆

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

دریا کنارے ایک گاؤں آباد تھا۔ گاؤں کے سب لوگ اَن پڑھ تھے۔ یہ لوگ علم کی اہمیت سے آگاہ نہیں تھے۔ گاؤں کا ایک آدمی ملازمت کے سلسلے میں شہر گیا۔ وہاں وہ ایک پڑھے لکھے شخص کے پاس ملازم ہو گیا۔ اُس نے وہاں سب سے پہلے جو لفظ سیکھا وہ ''آب'' تھا۔ ایک مرتبہ وہ گاؤں آیا تو اچانک شدید بیمار پڑ گیا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بار بار ''آب، آب'' پکار رہا تھا۔ اَن پڑھ ہونے کے باعث کوئی اس کی بات نہیں سمجھ رہا تھا۔ ایک پڑھے لکھے شخص کا وہاں سے گزر ہوا تو اُس نے گاؤں والوں کو اس لفظ کا مطلب سمجھایا تو وہ فوراً وہ چیز لے آئے جو بیمار شخص لانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ آپ نے کھوج لگانا ہے کہ بیمار شخص کیا چیز لانے کے لیے کہہ رہا تھا۔



مئی 2012ء میں شائع ہونے والے ''کھوج لگائیے'' کا صحیح حل: گولڈن الیون کے بلے باز ہمایوں نے تین گیندوں پر لگاتار تین چھکے لگائے، اس کے بعد بولر نے جو گیند کروائی وہ ''نوبال'' تھی۔ آخری گیند پر ہمایوں نے پھر چھکا لگایا، یوں گولڈن الیون نے 25 رنز کا ہدف پورا کر کے میچ جیت لیا۔

1۔ اسفند یار سلطان، لاہور
2۔ شعیب الرحمٰن، کراچی
3۔ خدیجہ جمیل، پشاور
4۔ محمد طلحہ خلیل، ملتان
5۔ محمد ابراہیم خان، فیصل آباد

ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔ جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 10 جون 2012ء ہے۔

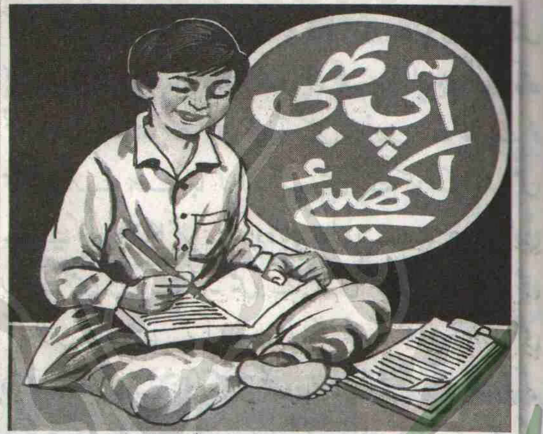
کھوج لگائیے!

نام: ____________

پتا: ____________

____





میرے بھیا

(فارحہ، کراچی)

میرے بھائی کا نام عثمان تھا، لیکن بچپن ہی سے میں انہیں بڑے بھیا کہہ کر پکارتا تھا۔ بچپن میں تو مجھے بڑے بھیا بہت اچھے لگتے تھے، لیکن جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا وہ مجھے بُرے لگنے لگے۔ جب میں سکول جانے لگا تو بڑے بھیا کے پرانے جوتے، پرانے



کپڑے، پرانی کتابیں اور پرانا بیگ سب کچھ میرا ہو گیا اور بڑے بھیا کو سب کچھ نیا مل گیا۔ جب میں نے احتجاج کیا کہ مجھے نیا بیگ چاہیے تو امی نے کہا:

''ایان بیٹا! تمہاری کتابیں کم ہیں، عثمان کو دیکھو، بیچارا ابھی بھی یہی کہہ رہا ہے کہ وہ پرانے بیگ میں ہی کتابیں لے جائے گا کیوں کہ وہ چاہتا ہے کہ تم نیا بستہ لو، لیکن وہ تمہیں نہیں مل سکتا.....''

''کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔

امی نے مجھے سمجھایا: ''کیوں کہ ابھی تم چھوٹے ہو اور وہ بیگ بہت بڑا ہے اور دُوسرا تم ابھی ابتدائی جماعت میں ہو اور تمہاری کتابیں بھی کم ہیں۔''

امی کے جواب نے مجھے مطمئن نہیں کیا۔ میرے ذہن میں مسلسل منفی خیالات رہنے لگیں اور میں اپنے بڑے بھیا کو اپنا دشمن سمجھنے لگا۔ مجھے ہر چیز بڑے بھیا کی استعمال شدہ ملتی تھی۔ وقت تیزی سے گزرنے لگا بڑے بھیا کے پرانے کپڑے اور پرانی کتابیں ہمیشہ کی طرح مجھے ملنے لگیں اور میرا احساس کمتری آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا، میں اپنے بڑے بھیا سے حسد کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ میں بھیا سے ایک نہ ایک دن ضرور انتقام ضرور لوں گا۔ پھر میری سکول کی پڑھائی بھی ختم ہو گئی۔ بڑے بھیا اب کالج سے فارغ ہو کر ملازمت کرنے لگے تھے۔ انہوں نے مجھے کالج سے لانے لے جانے کے لیے قسطوں پر موٹر سائیکل بھی خرید لی تھی۔ ہر مہینے ان کی تنخواہ سے قسط کٹ جاتی تھی۔ بھیا کا یہ احسان بھی مجھے کھٹکتا رہتا تھا۔ میں ہر وقت سوچتا رہتا تھا کہ اب میں بھیا سے انتقام لے سکتا ہوں کیوں کہ میں طاقت ور ہو گیا ہوں۔ میں ہر وقت ایک ہی بات سوچتا رہتا تھا۔ منفی سوچوں کی وجہ سے پڑھائی میں بھی میری دل چسپی واجبی سی تھی پھر دوست بھی آوارہ گرد تھے۔ اپنے دوستوں کے کہنے پر ایک دن میں دودھ میں زہر ملا کر بھیا کو دینے گیا۔ جب میں ان کے کمرے کے پاس پہنچا تو بڑے بھیا فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔

''ایان کو پتہ نہیں چلنا چاہیے، وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے ڈاکٹر صاحب۔''

میں سوچ میں پڑ گیا آخر کیا بات ہے اور مجھے کیا معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ بھیا کی آواز کانوں میں پڑی۔

''ڈاکٹر صاحب! زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ موت برحق ہے مجھے کینسر ہے، یہ بات ایان کو معلوم نہیں ہونی چاہیے ورنہ وہ ہر وقت پریشان رہے گا۔ وہ ابھی بچہ ہے اس کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں میں اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا۔''

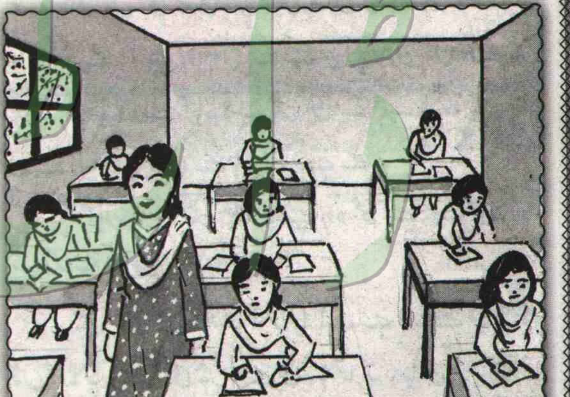
میں جو اپنے بھیا کو اپنے ہاتھوں سے زہر دینے آیا تھا ان کی بیماری کا سن کر میرے ہاتھوں سے دودھ کا گلاس چھوٹ گیا اور چھن کی آواز کے ساتھ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ اب میرے انتقام لینے کا جذبہ بھی سرد پڑ گیا۔ میں جلدی سے بھیا کے کمرے کی طرف بڑھا تا کہ ان سے معافی مانگ سکوں اور بُرے دوستوں سے چھٹکارا پا سکوں، جنہوں نے مجھے غلط راستہ دکھایا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ بھیا مجھ سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ اندھیرا میری آنکھوں سے چھٹ چکا تھا اور اب مجھے ہر منظر صاف صاف نظر آ رہا تھا۔

(پہلا انعام: 200 روپے کی کتب)

ایک غلطی

(عائشہ وحید، کراچی)

میں جماعت نہم کے بورڈ کے امتحان دے رہی تھی۔ سب بچے بہت اچھی تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ ایک عجیب سی خوشی تھی کہ پہلی دفعہ بورڈ کا امتحان دے رہے ہیں، پتا نہیں وہاں کا ماحول کیسا ہو؟ اساتذہ کیسے ہوں؟ اسی کش مکش میں ہم امتحانی کمرے میں پہنچے۔ سب بچے دُعائیں مانگ رہے تھے کہ کوئی اچھی ٹیچر



آئے، پیپر آسان ہو۔ میری نظر میری ہم جماعت ثناء پر پڑی وہ کچھ چھپا رہی تھی۔ میں نے غور کیا تو وہ چھوٹے چھوٹے کاغذ کے ٹکڑے چھپا رہی تھی۔ اس وقت کلاس میں کوئی ٹیچر نہیں تھی۔ میں اُس کے پاس گئی تو وہ چونک گئی۔ گھبراہٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ ثناء تم جو کرنے والی ہو وہ ٹھیک نہیں، تم اپنا ارادہ ترک کر دو اور جو کاغذ تمہارے پاس ہیں انہیں پھینک دو، مگر وہ نہ مانی۔ پھر میں اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ تھوڑی دیر بعد جماعت میں ٹیچر آ گئیں۔ انہوں نے طالبات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ میں سے کسی کے پاس نقل کے لیے کوئی کاغذ کا ٹکڑا ہے تو وہ باہر نکال دے ورنہ بعد میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔ میں نے نجمہ کی طرف دیکھا جو کہ ثناء کی کزن تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ ثناء کو سمجھاؤ کہ اب بھی وقت ہے۔ نجمہ نے ثناء کو سمجھایا مگر وہ نہ مانی آخر نجمہ بھی تنگ آ کر چپ ہو گئی۔ پھر پرچہ شروع ہوا۔ کچھ دیر بعد کلاس میں ٹیچر کی کڑک دار آواز گونجی: ”کھڑی ہو جائیں آپ۔“ سب بچے چونکے کہ یہ کس کو مخاطب کیا گیا ہے۔ ٹیچر ثناء سے مخاطب تھیں۔ وہ نقل کرتے ہوئے پکڑی گئی تھی۔ ٹیچر نے اس کا پرچہ منسوخ کر دیا۔ وہ بہت روئی، مگر ٹیچر نے اُس کی ایک نہ سنی۔ اُس کا رونا اور معافی مانگنا سب بیکار گیا۔ اُس کی غلطی نے اُسے نہ صرف سکول میں شرمسار کیا بلکہ پورے خاندان میں بھی رُسوا کیا۔ اُس کے والدین کو بھی اُس کی اس حرکت کی وجہ سے شرمندہ ہونا پڑا۔ نقل کرنے کے باعث اس پر ایک سال تک بورڈ کا امتحان نہ دینے کی پابندی عائد کر دی گئی۔ اس طرح ثناء کا ایک قیمتی سال ضائع ہو گیا۔

(دُوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

کہانی ایک چوہے کی

(احمد ظہیر، لاہور)

”احمد! چوہا۔“ مریم نے اتنا ہی کہا تھا کہ احمد نے فوراً کہا۔

”کیا میں چوہا ہوں؟“

”تم چوہے نہیں ہو، میں تو تمہیں کہہ رہی ہوں کہ وہ دیکھو چوہا الماری کے پیچھے گیا ہے۔“ مریم نے جواب دیا۔

”چوہا اور ہمارے گھر آ جائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”ایسا ہو چکا ہے۔“

”اب اگر ایسا ہو گیا ہے تو چوہا زیادہ دیر ہمارے گھر نہیں رہ سکتا، کیا چوہا مار مہم میں تم میرا ساتھ دو گی؟“

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

"تو پھر آؤ چوہے کو تلاش کرتے ہیں۔" احمد نے کہا۔

پھر دونوں بہن بھائی الماری کے پیچھے چوہے کو تلاش کرنے لگے۔

"یہاں تو کوئی چوہا نہیں ہے۔"

"میں نے خود چوہے کو الماری کے پیچھے جاتے دیکھا ہے۔" مریم بولی۔

"وہ دیکھو چوہا واشنگ مشین کے اُوپر ہے۔" احمد چوہے کو



دیکھتے ہی چلایا۔

اتنی دیر میں چوہا واشنگ مشین سے کود کر سلائی مشین کی طرف بڑھا۔ مریم نے صحن سے ایک ڈنڈا اٹھایا اور چوہے کا تعاقب جاری رکھا۔ سلائی مشین سے چوہا سیڑھیوں کی طرف گیا۔ اب دونوں سیڑھیوں کی جانب لپکے۔

"آج چوہا بچ کر نہ جائے۔" احمد نے بلند آواز میں کہا۔

پھر چوہا دیوار سے کود کر صحن میں آ گیا۔ مریم نے سیڑھیوں میں کھڑے کھڑے ڈنڈا گھما کر چوہے کی طرف پھینکا۔ ڈنڈا چوہے کو لگنے کی بجائے صحن میں لگی ٹیوب لائٹ کو جا لگا۔ چھن کی آواز کے ساتھ ٹیوب لائٹ صحن میں آ گری۔ دونوں نے ایک دُوسرے کو دیکھا۔

"اس سے قبل کہ امی جان آ جائیں ٹیوب لائٹ کی کرچیاں اکٹھی کر کے کوڑے دان میں ڈال دیتے ہیں۔" احمد کی بات سن کر مریم نے کہا۔

"ہاں، ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے، آؤ کرچیاں کوڑے دان میں ڈالتے ہیں۔"

پھر دونوں ٹیوب لائٹ کی کرچیاں اکٹھی کر کے کوڑے دان میں ڈالنے لگے تو ایک کرچی احمد کی انگلی میں چبھ گئی۔ اُس نے ایک ہلکی سی چیخ ماری۔

"ہائے، تمہاری انگلی میں سے تو خون نکل رہا ہے، آؤ تمہیں دوا لگا دیتی ہوں۔"

"ہائے آپی بہت درد ہو رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے احمد رو دیا۔

"رومت، ابھی دوا لگا دیتی ہوں۔" مریم جب دوا لینے کے لیے الماری کی طرف بڑھی تو چوہا وہاں موجود تھا۔ چوہے کو دیکھتے ہی مریم نے چیخ ماری اور دوا کی شیشی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر کر ٹوٹ گئی۔

"ایک اور مصیبت آن پڑی ہے، اب کیا ہوگا؟" مریم نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"امی جان آنے والی ہیں، دوا کی شیشی کی کرچیاں بھی اب اٹھانی پڑیں گی۔"

"وہ تمہاری انگلی کا زخم۔"

"خون بند ہو گیا ہے۔" احمد نے فوراً کہا۔

دونوں نے جلدی سے دوا کی شیشی کی کرچیاں کوڑے دان میں ڈالیں۔ چوہا اب کوڑے دان کے آس پاس پھر رہا تھا۔ چوہے کو دیکھ کر دونوں کو غصہ آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چوہا انہیں تنگ کر کے بہت خوش تھا۔

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" مریم یہ کہہ کر ایک مرتبہ پھر ڈنڈا ہاتھ میں پکڑے چوہے کا تعاقب کر رہی تھی۔ چوہا کچن کی طرف بڑھا تو مریم نے ڈنڈا گھما کر چوہے کی طرف پھینکا تو چولہے پر رکھی دودھ کی دیگچی نیچے گر گئی۔ دودھ فرش پر بہہ رہا تھا۔ دونوں نے پھر کچن کا فرش صاف کیا۔ چوہا ابھی تک زندہ تھا اور اِدھر اُدھر اچھل کود کر رہا تھا۔ دونوں اب تھک چکے تھے۔ کچھ دیر بعد چوہا صوفے کے پیچھے دکھائی دیا تو احمد ڈنڈا لے کر اُس کی طرف بڑھا۔

''میں چوہے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے احمد نے ڈنڈا پوری قوت سے دیوار پر مارا تو صوفے کے ساتھ رکھا گل دان زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا۔

''آج ہماری خیر نہیں، امی جان سے لازماً سزا ملے گی۔'' احمد نے کہا۔

جب امی جان گھر آئیں تو گھر الٹ پلٹ ہو چکا تھا۔ انہیں جب احمد اور مریم کے کارناموں کا علم ہوا تو ان کا غصہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔

''یہ سب کچھ ہم نے تو نہیں کیا۔'' مریم بولی۔

''تو پھر یہ سب کچھ کس نے کیا ہے؟'' امی جان نے پوچھا۔

''یہ سب کچھ چوہے کی وجہ سے ہوا ہے، چوہے کو مارتے ہوئے اتنا نقصان ہوا ہے۔''

''تو کیا چوہا مر گیا ہے؟''

''جی نہیں، چوہا ابھی تک زندہ ہے۔'' احمد کی بات سن کر امی جان نے انہیں سمجھایا۔

''جس طرح تم چوہے کو مارنے کی کوشش کرتے رہے ہو اس طرح چوہا تو نہ مر سکا البتہ ہمارا بہت سا نقصان ہو گیا ہے۔ چوہے کو مارنے کے لیے میں کڑکی لگاؤں گی اس طرح چوہا بھی مر جائے گا اور کوئی نقصان بھی نہیں ہو گا۔''

چوہے کو مارنے کا یہی صحیح طریقہ تھا دونوں نے اس طریقے کے بارے میں پہلے نہیں سوچا تھا۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

ماؤنٹ ایورسٹ پر پہلا ترک

(فرحان اشرف، بہاول نگر)

دُنیا کی سب سے بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والا پہلا ترک کوہ پیما ناصح مہ رخی 1968ء میں ترکی میں پیدا ہوا۔ ناصح کے دادا کے دادا کپتان دریا علی پاشا سلطنت عثمانیہ کی بحری فوج کے کمانڈر تھے۔ ناصح نے 1992ء میں بلقان یونیورسٹی سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں گریجوایشن کیا۔ اس یونیورسٹی نے جو کھیلوں اور کوہ پیمائی کے لیے مشہور ہے، ناصح کو کوہ پیمائی کی طرف راغب کیا۔ اس ترک نوجوان نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں آؤٹ ڈور کھیلوں میں بہت دل چسپی لی۔ اُسی زمانے میں اُس نے کوہ ارجیس پر گلائیڈر سے پرواز کی، بیوک ڈیمز کازک پہاڑ کو سر کیا اور کرگ گوزلر کے غاروں کے زیرِ زمین نہروں میں تیراکی کی۔ بلقان یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کے آخری سال کے دوران اس کی ملاقات ایک روسی پروفیسر ڈیمری کوروٹکن سے ہوئی جو یونیورسٹی کے انجینئرنگ کے شعبے میں پڑھاتے تھے۔ وہ لینن گراڈ یونیورسٹی کے کوہ پیما کلب کے رکن تھے۔ انھوں نے ناصح سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو لینن گراڈ یونیورسٹی کی اُس کوہ پیما جماعت میں شامل ہو سکتا ہے، جو قزاقستان میں تین شان کے پہاڑوں پر کوہ پیمائی کا پروگرام بنا رہی ہے۔ ناصح فوراً تیار ہو گیا۔ بلقان یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کا آخری مہینہ اُس نے اس مہم کی تیاری میں صرف کیا۔ پھر مہم پر قزاقستان روانہ ہوا۔ اگلے تین سال کے دوران ناصح نے سابق روسی جمہوریہ کی پانچ چوٹیوں کو سر کیا۔ سب ہی سات ہزار میٹر سے زیادہ تھیں۔ اس کامیابی کے نتیجے میں روسی کوہ پیمائی فیڈریشن نے اُسے برفانی چیتے کا خطاب دیا۔ لینن یونیورسٹی کے کوہ پیماؤں کے کلب کے تمام اراکین روسی تھے۔ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ وہ ان میں سے کسی کے ساتھ بھی باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی اس تنہائی کو دُور کرنے کے لیے اس نے ڈائری لکھنی شروع کر دی۔ اپنی اس مہم سے ترکی واپس آ کر اُس نے ایک کتاب مرتب کی جو ایک کوہ پیما کی ڈائری کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اپنی کوہ پیمائی کے بارے میں ناصح نے دو اور کتب ماؤنٹ ایورسٹ پر پہلا ترک، اور ایک تصاویر پر مشتمل کتاب شائع کی۔ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے میں ناصح کو دو ماہ کا عرصہ لگا، ناصح نے اس چوٹی پر 20 منٹ گزارے۔ اس طرح ناصح وہ پہلا ترک کوہ پیما بنا جس نے دُنیا کی بلند ترین چوٹی کو سر کر کے اپنے ملک وقوم کا نام روشن کیا۔

(اعزازی تحریر)



معلوماتِ عامہ

- آپ ﷺ کے جھنڈے کا نام عقاب تھا۔
- آپ ﷺ کے دو پیالوں کا نام عیر اور عیان تھا۔
- آپ ﷺ کی دو تلواروں کے نام مخدوم اور ذوالفقار تھے۔
- آپ ﷺ کی کمان کا نام کتوم تھا۔
- آپ ﷺ کی چھڑی کا نام مشواق تھا۔
- آپ ﷺ کی ڈھال کا نام زلوق تھا۔

(حسن رضا سردار، کامونکی)

- دُنیا کا سب سے بہترین اور بڑا نہری نظام پاکستان کا ہے۔
- دُنیا کی سب سے بڑی تازہ پانی کی جھیل ''لیک سپریئر'' ہے۔
- ایران اور برطانیہ کا قومی نشان گلاب ہے۔

(ثمین رابعہ، گوجرانوالہ)

- انسان کے ناخن سال میں تقریباً ڈھائی انچ بڑھتے ہیں۔
- سردیوں کی نسبت گرمی میں انسانی بال جلد بڑھتے ہیں۔
- اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ رقبہ سوڈان کا ہے۔

(سیدہ اقصیٰ گیلانی، کوہاٹ)

- دُنیا میں گرنارڈ نامی ایک مچھلی پائی جاتی ہے، جو اپنی بعض صفات کی وجہ سے دُوسری مچھلیوں سے ممتاز ہے۔ یہ مچھلی نہ صرف پانی میں تیر سکتی ہے بلکہ زمین پر چل بھی سکتی ہے اور ہوا میں اڑ بھی سکتی ہے۔

(اقراء خان، صادق آباد)

- قراردادِ پاکستان اسلامی تاریخ کے حساب سے 13 صفر 1359 ہجری میں پیش کی گئی تھی۔
- قراردادِ پاکستان ہفتہ کے دن پیش کی گئی تھی۔
- قراردادِ پاکستان منٹو پارک لاہور، موجودہ (اقبال پارک) کے مقام پر پیش کی گئی تھی۔
- قراردادِ پاکستان مسلم لیگ کے 27ویں اجلاس میں پیش کی گئی تھی۔
- قراردادِ پاکستان انگریزی زبان میں پیش کی گئی تھی۔
- قراردادِ پاکستان کا اُردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔
- قراردادِ پاکستان مولوی فضل الحق نے پیش کی تھی۔
- قراردادِ پاکستان کی سب سے پہلے تائید چوہدری خلیق الزمان نے کی تھی۔
- قراردادِ پاکستان کی سب سے پہلے تائید کرنے والی مسلم خاتون بیگم مولانا محمد علی تھیں۔
- قراردادِ پاکستان کی سب سے پہلے تائید کرنے والے کانگریس کے رہنما کا نام راج گوپال اچاریہ تھا۔
- قراردادِ پاکستان میں پاکستان کا لفظ ایک بار بھی نہیں آیا۔

(فرخ شہباز وڑائچ، راولپنڈی)

- کیڑے مکوڑوں میں سب سے خوب صورت تتلیاں ہوتی ہیں۔
- دُنیا میں تتلیوں کی تقریباً 20 ہزار اقسام ہیں۔
- تتلیاں انڈے دیتی ہیں۔ ان کے انڈے رنگ، جسامت اور شکل میں ایک دُوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔
- تتلیاں اپنے پروں کے رنگوں کی مدد سے اپنے جسم کا درجہ حرارت برقرار رکھتی ہیں۔
- تتلیوں کے جسم کا درجہ حرارت 30 ڈگری سینٹی گریڈ سے کم ہو تو یہ اُڑ نہیں سکتیں۔
- تتلیوں کے سر کے اُوپر والے حصے میں دو دھاگے سے لگے ہوتے ہیں انہیں ''انٹینا'' کہتے ہیں۔ ان کی مدد سے یہ سونگھنے اور اِردگرد کے ماحول کے بارے میں جانتی ہیں۔
- تتلیوں کی غذا میں پھولوں کا میٹھا رس، پانی اور مختلف محلول شامل ہیں۔ شہد ان کا پسندیدہ مشروب ہے۔
- تتلیاں زیادہ سردی برداشت نہ کرنے کی وجہ سے گرم علاقوں کی طرف چلی جاتی ہیں۔
- تتلیوں کی اوسط عمر 3 سے 4 ماہ تک ہوتی ہے۔

(عبداللہ ایوب، جہلم)

مختصر مختصر

تین دوست

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ایک شخص کے تین دوست تھے۔ جب وہ مرنے لگا تو ایک کو بلا کر پوچھا کہ اس مشکل وقت میں تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں عمر بھر آپ کی خدمت کرتا رہا لیکن اب میں بالکل بے بس ہوں اور موت کو کسی طرح نہیں روک سکتا۔ پھر دُوسرے کو طلب کیا وہ کہنے لگا میں اس مشکل وقت میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ مرنے کے بعد آپ کو نہلاؤں، کفن پہناؤں، خوش بو میں بساؤں، جنازہ اٹھاؤں، کسی عمدہ جگہ قبر بنا کر اس میں دفن کر دوں، اس کے بعد قبر پر پھول چڑھا کر واپس آ جاؤں۔ اس کے تیسرے دوست کو بلایا وہ کہنے لگا کہ آپ فکر نہ کریں میں موت کے بعد بھی آپ کا ساتھ دوں گا، قبر میں آپ کے ہمراہ جاؤں گا اور جب آپ قیامت کے دن قبر سے نکلیں گے تو میں آپ کا ساتھ دوں گا۔

آپ ﷺ نے فرمایا پہلے دوست کا نام مال، دُوسرے کا عیال اور تیسرے کا اعمال ہے۔

(قمر ناز دہلوی، کراچی)

صدقہ

سیدنا ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔

''صدقہ دینے سے کوئی مال نہیں گھٹتا جو بندہ معاف کر دیتا ہے، اللہ اُس کی عزت بڑھاتا ہے اور جو بندہ اللہ تعالیٰ کے لیے عاجزی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتا ہے۔

(امان علی، میر پور)

بڑوں کا ادب

حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں خیبر تین یہودیوں کی بستی تھی۔ وہاں پر ایک مسلمان کو یہودیوں نے قتل کر دیا تھا، جن صاحب کو قتل کیا گیا تھا ان کے ایک بھائی تھے جو اس مقتول کے والی تھے۔ وہ بھائی اپنے چچا کو لے کر حضور اقدس ﷺ کے پاس یہ بتانے کے لیے آئے کہ ہمارا بھائی قتل کر دیا گیا، اب اس کا بدلہ لینے کا کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ چوں کہ یہ جو بھائی تھے، ہر رشتہ کے اعتبار سے مقتول کے زیادہ قریبی تھے اور دُوسرے چچا تھے۔ یہ دونوں حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور مقتول کے بھائی نے حضور اقدس ﷺ سے بات کرنی شروع کی اور چچا خاموش بیٹھے تھے، تو اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے بھائی سے فرمایا کہ کَبِّرِ الْکُبْرَ ''بڑے کو بڑائی دو۔''

یعنی جب ایک بڑا تمہارے ساتھ موجود ہے تو پھر تمہیں گفتگو کا آغاز نہیں کرنا چاہیے، بلکہ تمہیں اپنے چچا کو کہنا چاہیے کہ گفتگو کا آغاز کریں، پھر جب ضرورت ہو تو تم بھی درمیان میں گفتگو کر لینا، لیکن بڑے کو بڑائی دو۔ (بخاری، مسلم)

اسلامی آداب کا یہ تقاضا ہے کہ جو عمر میں بڑا ہو، اس کو آگے کیا جائے۔

(امتیاز علی، لاہور)

علم کی قدردانی

علم کی قدردانی کے بارے میں امام تیمیہ کا یہ واقعہ مشہور ہے۔ جب ان کے وطن خراسان پر تاتاریوں نے حملہ کیا تو انہوں نے وہاں سے دمشق کی طرف ہجرت کی، اس ہجرت میں انہوں نے اپنا سارا سامان تو وہیں چھوڑ دیا مگر اپنی کتابوں کا ذخیرہ ساتھ لے گئے۔ راستے میں بہت بُری حالت ہوئی۔ ایک تو ہر وقت تاتاریوں کے حملے کا اندیشہ تھا۔ عورتیں اور بچے بھی ساتھ تھے۔ جب گاڑی چلانے کے لیے جانور نہ رہے تب بھی اپنی کتابیں نہ چھوڑیں بلکہ جانور کی جگہ گاڑی کو کھینچتے رہے۔ ایک جگہ گاڑی باوجود کوشش کے نہ چلی تو سارا خاندان مل کر خدا کے حضور اتنا گڑگڑایا کہ خدا کی رحمت جوش میں آ گئی اور گاڑی چل کر دمشق پہنچی۔ کتابوں کو خزانہ

سمجھ کر حفاظت کرنے کی وجہ سے آج بھی اُن کا نام زندہ ہے۔

(ارسلان سلیم، نوشہرہ)

نیند کیوں نہیں آتی؟

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے کسی نے پوچھا: یا حضرت! یہ کیا وجہ ہے کہ محفل رقص و سرور میں انسان بیٹھا رہتا ہے اور اسے نیند نہیں آتی، لیکن جب عبادت کرنے لگتا ہے تو اُسے نیند آ جاتی ہے۔ حضرت نے جواب دیا کہ دیکھو بھائی! دو چارپائیاں ہیں۔ ایک پر کانٹے ہیں دُوسری پہ پھولوں کی سیج، اب جس پہ کانٹے ہیں وہ چارپائی محفل رقص و سرور کی ہے اور جس پر پھولوں کی سیج ہے وہ عبادت کی چارپائی ہے۔ بس یہی وجہ ہے کہ ناچ گانے والی محفل میں نیند نہیں آتی اور عبادت کے وقت سکون کی نیند آتی ہے۔

(مسز فاخرہ علی جوئیہ، خوشاب)

مکھی

ایک مرتبہ خلیفہ منصور عباسی کے منہ پر ایک مکھی آ کر بیٹھ گئی۔ منصور نے اس کو بھگا دیا۔ وہ مکھی بار بار آ کر بیٹھتی اور تنگ کرتی رہی۔ آخر منصور پریشان ہو گیا۔ اتنے میں امام جعفر صادقؒ آ گئے۔ منصور نے ان سے پوچھا: ''مکھی کس لیے پیدا کی گئی ہے؟'' امام صاحب نے جواب دیا: ''جابروں کو ذلیل کرنے کے لیے۔'' یہ سن کر منصور ان کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

(دانیال احمد، کراچی)

دو نقص

خلیفہ مہدی نے ایک نیا محل تعمیر کروایا، اور حکم دیا کہ کسی شخص کو اس کے نظارے سے نہ روکا جائے۔ دیکھنے والے یا تو دوست ہوں گے یا پھر دشمن۔ اگر دوست ہوئے تو خوش و خرم ہوں گے اور اگر دشمن ہوئے تو حسد کی آگ میں جل جائیں گے اور ہر شخص کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا دشمن اذیت میں مبتلا رہے۔ کچھ لوگ کسی خرابی کی بات بتائیں گے، جس سے خرابی کو دُور کیا جا سکے گا۔

ایک فقیر بھی یہ محل دیکھنے آیا اور بولا:

''اس محل میں دو غیر معمولی نقص ہیں: ایک یہ کہ آپ اس میں ہمیشہ نہ رہیں گے اور دُوسرا یہ کہ محل ہمیشہ نہیں رہے گا۔''

(ردا رحمٰن، کہوٹہ)

نماز کی پابندی

سر سید احمد خان بہت بڑے عالم تھے۔ اور دین کے معاملے میں آپ بہت سختی کرتے تھے۔ وہ نماز بہت باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ اور دُوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں آپ اپنے شاگردوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ تمام طالبہ آپ کی نگرانی میں نماز پڑھتے تھے۔ نمازِ عصر کے بعد طلبہ میدان میں کرکٹ کھیلتے تھے۔ اس لیے مغرب کی نماز میں غفلت کرتے تھے۔ سر سید احمد خان بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ اس لیے طلبہ اُن کا ہر حکم مانتے تھے۔

ایک دفعہ آپ نمازِ مغرب کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں کھیل کا میدان آتا تھا اور میدان میں لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ انہوں نے جب سر سید کو اپنی طرف آتے دیکھا تو فوراً میدان میں صفیں باندھیں، ایک لڑکا امام بن گیا، اور جماعت شروع کر دی۔ آپ نے نماز کی امامت ہوتے دیکھی تو آپ بھی جماعت میں شامل ہو گئے۔ اُدھر شریر امام نے جلدی جلدی رکوع اور سجدے کر کے سلام پھیر دیا کہ سر سید صاحب تو ہمیں نماز پڑھتے دیکھ کر مسجد میں چلے گئے ہوں گے اس لیے اس نے سلام پھیرتے ہی کہا: ''او! بوڑھا جی چلے گئے ہیں۔''

جب باقی طلبہ نے سر سید احمد خان کو اپنے پیچھے نماز پڑھتے دیکھا تو حیرانی سے ایک دُوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جب کہ آپ سکون سے نماز ادا کر کے وہاں سے چلے گئے۔

(وجیہہ رؤف، لاہور)

موتی

ایک مرغ بھوک سے بے تاب دانے دنکے کی تلاش میں کوڑے کا ڈھیر کرید رہا تھا۔ کافی محنت کے بعد اُسے ایک موتی ملا جو بہت قیمتی تھا۔ موتی دیکھ کر مرغے نے بڑی حسرت سے کہا: ''افسوس! اتنی محنت کے بعد ملا بھی تو موتی...... جس سے نہ میرے دل کو تسلی ہو سکتی ہے نہ میری بھوک کو تسکین...... کاش مجھے اس کے بدلے گندم یا چنے کا دانہ مل جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔''

(مناہل خواجہ، چشمہ)



درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ کس سورۃ کو تین مرتبہ پڑھنے سے پورے قرآن مجید کا ثواب ملتا ہے؟

i۔ سورۃ الناس ii۔ سورۃ اخلاص iii۔ سورۃ الکوثر

2۔ حضور ﷺ کا وصال کس دن ہوا تھا؟

i۔ پیر ii۔ اتوار iii۔ بدھ

3۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کون سا معجزہ عطا کیا تھا؟

i۔ ہوا پر قابو پانا ii۔ بادلوں پر قابو پانا iii۔ مُردوں کو زندہ کرنا

4۔ حضرت حسان بن ثابتؓ کس مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر نعتِ رسول ﷺ پڑھا کرتے تھے؟

i۔ مسجدِ نبوی ﷺ ii۔ مسجد قباء iii۔ مسجد الحرام

5۔ انسان کے علاوہ کس اور جان دار کو زکام ہوتا ہے؟

i۔ ہاتھی ii۔ بندر iii۔ گدھا

6۔ کیمیا کس زبان کا لفظ ہے؟

i۔ اُردو ii۔ لاطینی iii۔ عربی

7۔ ٹیلی ویژن کے موجد کا کیا نام ہے؟

i۔ جان لوئی بیرڈ ii۔ گراہم بیل iii۔ مارکونی

8۔ "ہیٹ ٹرک" کی اصطلاح سب سے پہلے کس کھیل میں استعمال کی گئی تھی؟

i۔ فٹ بال ii۔ کرکٹ iii۔ ہاکی

9۔ اسلام آباد کو پاکستان کا دارالحکومت کب بنایا گیا تھا؟

i۔ یکم اگست 1960ء ii۔ 14 اگست 1960ء iii۔ 23 مارچ 1960ء

10۔ مرزا اسد اللہ خان غالب کی وجۂ شہرت کیا ہے۔

i۔ گلوکاری ii۔ شاعری iii۔ اداکاری

جوابات علمی آزمائش مئی 2012ء

1۔ سہیل بن عمرو 2۔ انگور 3۔ شریک سفر 4۔ ایڈورڈ ڈیملر 5۔ مہرالنساء 6۔ لاہور 7۔ ڈرامہ نگاری 8۔ کرکٹ 9۔ ایران 10۔ سات

اِس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ زینت فاطمہ، کراچی۔ (200 روپے کی کتب)

☆ محمد اثمار علی خان، گوجرانوالہ (175 روپے کی کتب)

☆ احمد ابراہیم حسن، خانیوال (125 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

☆☆ خدیجہ ریاض، گوجرانوالہ۔ اسد علی، ملتان۔ آفتاب الرحمٰن، کرک۔ عبدالحنان، فیصل آباد۔ محمد زبیر ارشد، ملتان۔ ربیعہ ملک، جھنگ صدر۔ ناظرہ مقدس، شرقپور شریف۔ زین العابدین، لالہ موسیٰ۔ علی رضا چاند، بھابڑہ۔ محمد سعد خلیل، ملتان۔ اشہد ذیشان، دریا خان۔ رابعہ وسیم، سیال کوٹ۔ وقاص شوکت، فیصل آباد۔ انصر صابر، وہاڑی۔ عائشہ اکرم، اوکاڑہ۔ غلام مصطفیٰ، محمد خرم شہزاد، محمد جاوید علی، محمد شہروز علی، محمد ذیشان شیرازی، ملتان، علی احسان، لاہور۔ فتح محمد شارق، مریم نایاب، نوشہرہ۔ عائشہ سید، ملتان۔ محمد فیاض الحسن، تلہ گنگ۔ طہٰ یاسین، حیدر آباد۔ شمائلہ کرن، راول پنڈی۔ محمد ابوبکر اشرف آرائیں، کبیر والا۔ محمد عتیق الرحمٰن، چکسواری۔ ثناء جمال، اسلام آباد۔ رابعہ لائق، فیصل آباد۔ سید محمد مصطفیٰ، لاہور۔ محمد محسن علی قادری، محمد دانش رضا قادری، حامد رضا قادری، حسن رضا سردار، کامونکی۔ حافظ زین لطیف، گوجرانوالہ۔ مناہل زمان، پشاور۔ محمد سمیع اللہ صادق، کومل صادق چوہدری، مومنہ حمید، گوجرانوالہ۔ طارق عزیز، کوٹری۔ ماجد نواز، کوئٹہ۔ محمد باسط رضا، کراچی۔ اسامہ بن طاہر، منڈی بہاؤالدین۔ عائشہ مجید، لاہور۔ محمد شہزاد، نوشہرہ۔ صبا رانی ملک، آمنہ مسعود، اسلام آباد۔ منیر احمد شاہین، محمد نعمان شیخ، قدیر احمد شیخ، کشمور۔ جنید نعیم دیوان، حویلی لکھا۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 جون 2012ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ____________________

مقام: ____________________

پتا: ____________________

____

____

آپ کا خط ملا



مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' کی اشاعت کے 71 سال پورے ہونے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ الحمد للہ ہمارا پیارا تعلیم و تربیت 72ویں سال میں قدم رکھ چکا ہے۔ میں تعلیم و تربیت کا تقریباً پچاس سال سے قاری ہوں اور اس کے لیے لکھتا بھی رہا ہوں۔ 45 سال قبل ''تعلیم و تربیت'' میں شائع ہونے والے اپنے ایک خط کی کٹنگ بھیج رہا ہوں۔ جس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ ہمارا تعلیم و تربیت سے کتنا پرانا تعلق ہے۔

(کے ایم اسلم بٹ، گوجرانوالہ)

آنسو، منحوس گھڑی اور مہک بہت اچھی تحریریں تھیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ علی اکمل تصور، نذیر انبالوی اور محمد فاروق دانش کی تصویریں بھی رسالہ میں شائع کریں۔ (سید علی مجتبیٰ، گجرات)

☆ آپ کی خواہش پوری کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مئی کا شمارہ لاجواب تھا۔ (شائلہ رضا، لاہور)

اس بار چچا تیز گام سیڑھیوں سے گرے اور ٹیپو سلطان بہترین تحریریں تھیں۔ (طلحہٰ فاروق، راول پنڈی)

کھیل دس منٹ کا اور اوجھل خاکے بہترین سلسلے ہیں۔

(ام ایمن، بہاول پور)

چچا تیز گام سیڑھیوں سے گرے، گولو گرین، جیان کی پٹائی اور ایک تھی چڑیا زبردست کہانیاں تھیں۔ نظم ٹریفک کے اشارے بہت اچھی تھی۔ انوکھی دُنیا بہت دل چسپ ناول ہے۔

(صبا یوسف، لاہور)

مہک، ایک تھی چڑیا، گولو گرین، چچا تیز گام سیڑھیوں سے گرے، جیان کی پٹائی اور آنسو اچھی کہانیاں تھیں۔

(طوبیٰ یوسف، لاہور)

نظم ''مئی کا مہینہ'' بہت پسند آئی۔ (زین العابدین، لالہ موسیٰ)

مئی کا شمارہ 30 اپریل کو مل گیا تھا۔ تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ ناول ''انوکھی دُنیا'' اچھا ہے۔ (سلمان ریاض، گوجرانوالہ)

مئی کا شمارہ زبردست تھا۔ کہانیوں میں مہک، ٹیپو سلطان، خطرناک چیتا اور آنسو عمدہ تھیں۔ کھیل اور کھلاڑی پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ انکل! کیا میں سائنسی موضوع پر کوئی کہانی بھیج سکتا ہوں؟ (محمد زبیر جھنگوی، جھنگ)

☆ ضرور بھیجیے۔

ناول انوکھی دُنیا بہت کمال ہے۔ کہانیوں میں چچا تیز گام سیڑھیوں سے گرے، مہک، گولو گرین اور ایک تھی چڑیا اچھی تھیں۔ سلسلہ کھوج لگایئے بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اسے جاری رکھیے گا۔

(عمر فاروق، دینہ)

☆ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

''مختصر مختصر'' بہت اچھا سلسلہ ہے۔ (محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ)

مئی کے شمارے کا سرورق ٹریفک کے اشاروں پر مبنی تھا۔ سڑک پر ہونے والے حادثات کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم ٹریفک کے اشاروں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ دُنیا کے مہذب معاشروں میں وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو اصولوں کی پاس داری کرتی ہیں۔ اس مناسبت سے یہ اچھا پیغام دیا گیا کہ ہماری سلامتی اسی میں ہے کہ ہم ان ٹریفک کے اشاروں کو یاد رکھیں اور ان پر عمل بھی کریں۔

(محمد زبیر ارشد، ملتان)

کہانیاں ایک تھی چڑیا، جیان کی پٹائی اور ورثہ بہت پسند آئیں۔

(معاذ احمد، لاہور)

میں کافی عرصہ سے آپ کا رسالہ پڑھ رہا ہوں۔ ایک نعت بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے اسے رسالے میں جگہ دیں گے۔

(محمد عبدالحسیب، سرگودھا)

☆ آپ ابھی کسی استاد سے اصلاح لیں تاکہ آپ کی تحریر میں نکھار آسکے۔

تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ ٹریفک کے اشارے نظم بہت پسند آئی۔

(خدیجہ ریاض، گوجرانوالہ)

کہانی جیان کی پٹائی بہت پسند آئی۔ (عبداللہ، کراچی)

خطرناک چیتا، گولوگرین، چچا تیز گام اور جیان کی پٹائی عمدہ تحریریں تھیں۔ (فتح محمد شارق، نوشہرہ)

مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ میں اس کا ہر شمارہ پڑھتا ہوں۔ بلاعنوان، کھوج لگائیے، کھیل اور کھلاڑی، ہونہار مصور اور اوجھل خاکے میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ (معظم نعمان، گوجرانوالہ)

مہک، منحوس گھڑی، خطرناک چیتا، ٹریفک کے اشارے، سنہرے لوگ اور آنسو اچھی تحریریں تھیں۔ (غلام نبی نوری، کھڈیاں خاص)

مئی کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ (محمد ذیشان معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

منحوس گھڑی، ایک تھی چڑیا، گولوگرین، مئی کا مہینہ، چچا تیز گام سیڑھیوں سے گرے اور ٹریفک کے اشارے اچھی تحریریں تھیں۔ (کومل امجد، ملتان)

مئی کے شمارے میں گولوگرین اور چچا تیز گام سیڑھیوں سے گرے زبردست کہانیاں تھیں۔ (زرتاب جمال، گوجرانوالہ)

ٹیپو سلطان، مہک اور آنسو اچھی تحریریں تھیں۔ (محمد حذیفہ انوار، جھنگ)

مئی کے شمارے میں گولوگرین کہانی بہت اچھی تھی۔ (فرح ناز، اقراء ناز، گجرات)

آپ ہر شمارے میں حمد اور نعت ضرور شائع کیا کریں۔ (شہزاد جمیل، کراچی)

مئی کا شمارہ عمدہ تھا۔ (اسامہ راشد، ٹیکسلا)

مئی کا رسالہ بہت اچھا تھا۔ کہانی چچا تیز گام سیڑھیوں سے گرے بہت اچھی تھی۔ ڈرائنگ والا سلسلہ کبھی ختم نہ کیجئے گا۔ (اویس اظہر اقبال، گجرات)

مہک، چچا تیز گام سیڑھیوں سے گرے، گولوگرین، جیان کی پٹائی، آنسو اور خطرناک چیتا اچھی کہانیاں تھیں۔ ''انوکھی دُنیا'' دل چسپ ناول ہے۔ (پھول پرویز، فیصل آباد)

آنسو، مہک، منحوس گھڑی اور گولوگرین بہت اچھی کہانیاں تھیں۔

کہانی جیان کی پٹائی پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ (علی رضا چاند، بھابڑہ)

''آنسو'' مئی کے شمارے کی سب سے جان دار تحریر تھی۔ جسے پڑھ کر دل بھر آیا۔ (حسنین قادری، حسن رضا سردار، کامونکی)

مئی کا شمارہ زبردست تھا۔ خطرناک چیتا اور جیان کی پٹائی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ (محمد فیاض الحسن، تلہ گنگ)

مئی کا شمارہ لاجواب تھا، جیان کی پٹائی کہانی پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ (علی شہروز، فیصل آباد)

سرورق بہت اچھا تھا۔ اداریہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ (محمد حسن رضا، لاہور)

انکل! آپ کوئی سائنسی سلسلہ شروع کریں۔ (معاذ احمد صدیقی، کندیاں)

☆ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا میں سائنسی معلومات بھی شائع کی جاتی ہیں۔

ناول ''انوکھی دُنیا'' بہت اچھا ہے۔ (طاہرہ رضا، لاہور)

مئی کا شمارہ اچھا تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ ہونہار مصور کا سلسلہ جاری رکھیں۔ یہ بہت اچھا سلسلہ ہے۔ (ثناء جمال، اسلام آباد)

منحوس گھڑی، گولوگرین، چچا تیز گام سیڑھیوں سے گرے اور انوکھی دُنیا قابلِ تعریف تحریریں تھیں۔ (محمد سعود احمد رانا، اوکاڑہ)

مئی کا شمارہ رنگا رنگ تصویروں، عمدہ کہانیوں، دل چسپ نظموں اور انوکھی معلومات سے سجا ہوا ملا۔ تمام تحریریں عمدہ تھیں۔ (محمد محسن علی قادری، کامونکی)

اس مرتبہ کا سرِورق بہت معلوماتی تھا۔ اوجھل خاکے بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اسے جاری رکھئے گا۔ ناول انوکھی دُنیا بہترین ہے۔ (ماریہ وسیم، کراچی)

بچوں کا انسائیکلوپیڈیا پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ (علی حسنین، بھوآنہ)

مہک، چچا تیز گام سیڑھیوں سے گرے، آنسو اور جیان کی پٹائی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ (محمد ضیاء اللہ، میاں والی)

مئی کا شمارہ لاجواب تھا۔ انوکھی دُنیا ناول بہت شان دار ہے۔ کیا ''بلاعنوان'' کا ایک سے زیادہ عنوان بھیجا جا سکتا ہے؟ (نعمان صمریز، راول پنڈی)

☆ ایک سے زیادہ عنوان بھیجے جا سکتے ہیں۔

کہانیوں میں جیان کی پٹائی، خطرناک چیتا اور آنسو بہت پسند آئیں۔ (سید عبدالاحد، فیصل آباد)

مئی کا شمارہ بہت پسند آیا۔ جیان کی پٹائی، مہک اور چچا تیز گام سیڑھیوں سے گرے عمدہ کہانیاں تھیں۔ (محمد خزیمہ، چکسواری)

ایک دل چسپ ناول

(قسط نمبر 6)



انوکھی دُنیا

ظفر حسنین

"اب بہت مشکل ہو جائے گی، ہمارے لیے آپس میں بات کرنا بھی ممکن نہیں ہوگا۔" کالے رنگ کے جوتے کی بات سن کر دُوسرا جوتا بولا۔

"ہاں ایسا ہی ہے، ڈولی نے انہیں منتر بتا کر اچھا نہیں کیا۔"

"ڈولی اور اس کی سہیلیوں کو بھی شیلف میں باتیں کرنے میں مشکل ہوگی، وہ تو ہر وقت اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی رہتی ہے۔"

پھر دونوں جوتے خاموش ہو گئے۔ عمر اور عائشہ ان کی باتیں سن چکے تھے۔ عمر نے دوبارہ منتر پڑھا، مگر جوتوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ ڈولی نے شیلف سے اتر کر عمر کے کان میں سرگوشی کی۔

"عمر! اس طرح منتر پڑھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

"تو پھر کیسے منتر پڑھوں؟" عمر نے سوال کیا۔

"اگر تم اپنی آس پاس کی چیزوں کی باتیں سننا چاہتے ہو تو چپکے سے منتر پڑھا کرو اور اس طرح ظاہر کرو کہ تم ان کی باتیں نہیں سن رہے۔" ڈولی کی بات سن کر عمر بولا۔

"میں ایسا ہی کروں گا۔"

اسی اثناء میں جوتے پھر اپنی جگہ سے ہلنے لگے۔ عمر نے منہ دُوسری طرف کر کے منتر پڑھا تو جوتوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ عمر اور عائشہ ایک طرف کتاب لے کر بیٹھ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کتاب پڑھ رہے ہوں۔ ان کی نظریں تو کتاب پر تھیں، مگر کان جوتوں کی طرف تھے۔

"مجھے تو ابھی تک درد محسوس ہو رہا ہے۔" کالا جوتا بولا۔

"کیسا درد؟" دُوسرے جوتے نے سوال کیا۔

"کل عمر مجھے پہن کر گلی سے گزر رہا تھا تو اُس نے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری تھی۔ میری تو اُس وقت چیخ نکل گئی تھی۔ وہ کافی دیر تک پتھر کو ٹھوکریں مارتا رہا، میں چیختا چلّاتا رہا مگر عمر اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔" کالے جوتے کا لہجہ افسردہ تھا۔

یہ سن کر عائشہ نے عمر کو گھورا تھا۔ عمر نے کل ایسا ہی کیا تھا۔ پھر دونوں رات کے کھانے کے لیے کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ امی ابو پہلے سے وہاں موجود تھے۔ وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ

ابو جان نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میرے پیارے بچو! میں کل صبح اسلام آباد جا رہا ہوں، میری واپسی پندرہ دن بعد ہوگی۔''

''پاپا! وہ میرے سکول میں ڈرامہ ہو رہا ہے، آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ ڈرامہ دیکھنے ضروری آئیں گے۔'' عمر بولا۔

''ہاں وعدہ تو کیا تھا، مگر کیا کریں ایک ضروری کام سے مجھے اسلام آباد جانا پڑ رہا ہے، تم ڈرامے کی ویڈیو بنا لینا میں واپس آ کر ویڈیو دیکھ لوں گا، تمہاری ماما ڈرامہ دیکھنے جائیں گی۔'' ابو جان نے کہا۔

کھانا کھاتے ہوئے برتن ذرا سے ہلے تو عمر اور عائشہ نے جان لیا کہ وہ آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ عمر نے ہولے ہولے منہ میں منتر پڑھا۔ اب وہ برتنوں کی باتیں سن سکتا تھا۔ ڈولی نے اُسے بتایا تھا کہ اگر وہ منتر پڑھ کر یہ کہہ دے کہ چیزوں کی باتیں صرف وہی سنے گا تو کوئی دُوسرا یہ باتیں نہیں سن سکے گا۔ عمر نے اب منتر پڑھ کر یہی کہا تھا کہ صرف وہی چیزوں کی باتیں سننا چاہتا ہے۔ برتن اور برتنوں میں رکھی مزے دار کھانے کی چیزیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ پانی کے جگ نے کہا۔

''یہ لوگ جب بھی کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں بس آپس میں باتیں ہی کرتے رہتے ہیں، کھانے کے وقت بولنا نہیں چاہیے۔''

''جگ بھیا! تم ٹھیک کہتے ہو، کھانا خاموشی سے کھانا چاہیے۔'' شیشے کے گلاس نے جگ کی تائید کی۔

''بیٹا! چکن لے لو، چکن تو آج رمضانی نے مزے دار پکایا ہے۔'' امی جان نے چکن عائشہ کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں کھانا چکن، رمضانی نے پچھلی مرتبہ تو نہایت بدمزہ چکن پکایا تھا، میں چکن نہیں کھاؤں گی۔'' عائشہ نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

امی جان اصرار کرتی رہیں اور عائشہ انکار کرتی رہی۔ آخر امی جان کو ہار ماننا پڑی۔

''دیکھ رہے ہو تم سب، کس طرح کے ہیں یہ بچے۔'' پلیٹ نے کہا۔

''یہ ناشکرے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی قدر نہیں، دُنیا میں بے شمار بچے ایسے ہیں جنہیں یہ نعمتیں میسر نہیں۔'' جگ بولا۔

''اچھا یہ کوفتے کھا لو، بہت مزے کے ہیں یہ کوفتے۔'' امی جان بولیں۔

''نہیں کھانے مجھے کوفتے، زہر لگتے ہیں مجھے کوفتے۔'' عائشہ چلّائی۔

''بہت بُری بات، بڑوں سے بھلا یوں بات کرتے ہیں۔'' ابا جان نے عائشہ کو سمجھایا۔

عمر خاموشی سے کھانا کھاتے ہوئے برتنوں کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ برتن اور کھانے پینے کی اشیاء ایسی باتیں کر سکتی ہیں۔ عمر کی بھی یہ عادت تھی کہ وہ ہر کھانے کی چیز میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور نکالتا تھا۔ اس نے کبھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا تھا۔

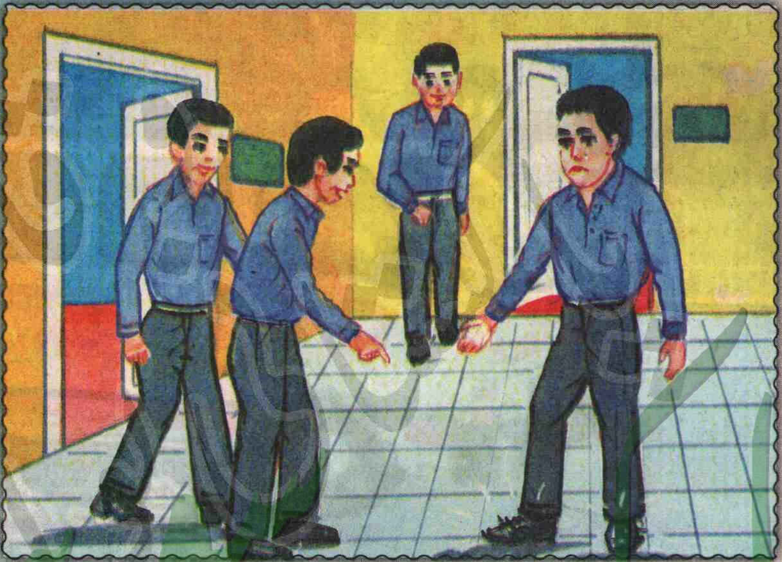
☆......☆......☆

دُوسرے دن عمر سکول گیا تو تفریح کے وقت میں اُس کی نظر جواد کے جوتوں پر پڑی۔ وہ مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ ان کی حالت بہت خراب تھی۔ جوتے کے تسمے بھی خراب تھے۔ عمر نے دُوسری طرف منہ کر کے منتر پڑھا تو جواد کے جوتے نہایت دکھ بھرے لہجے میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''اس بچے سے نہ جانے کب ہماری جان چھوٹے گی، اسے ہمارا ذرا بھی خیال نہیں اس کی امی جان تو ہمیں پالش لگا کر چمکتی اور خوب صورت بناتی ہیں، مگر یہ بچہ تو ہماری حالت ہی خراب کر دیتا ہے۔'' دائیں طرف کا جوتا غم زدہ لہجے میں بولا۔

''میری حالت تو تم سے بھی بُری ہے، میری ایڑی خراب ہو چکی ہے، جب یہ تیز تیز چلتا ہے تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے، ہم اس کے پاؤں کی حفاظت کرتے ہیں، اس کا خیال رکھتے ہیں، مگر یہ ہماری حفاظت نہیں کرتا۔'' بائیں طرف کا جوتا بھی بولا۔

ابھی جوتے باتیں کر رہے تھے کہ گراؤنڈ میں سے ایک



فٹ بال برآمدے کی طرف آیا۔ جواد بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور فٹ بال کو ایک زور دار کک لگائی۔ دائیں طرف کے جوتے نے چیخ مارتے ہوئے کہا۔

''ہائے میں مرگیا، کوئی مجھے بچائے، کوئی مجھے اس ظالم سے نجات دلائے، میں تو سکول میں پہننے کا جوتا ہوں، کھیلنے کے جوتے تو اور ہوتے ہیں۔ ہائے درد سے میرا بُرا حال ہے۔''

عمر یہ چیخ و پکار سن رہا تھا۔ اُس نے ایک نظر اپنے جوتے پر ڈالی۔ ان کی حالت بھی جواد کے جوتوں سے مختلف نہ تھی۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ جواد کو اُس کے جوتوں کی باتیں سنائے۔ وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے لگا تو اُسے خیال آیا کہ اس طرح تو سکول کے بچوں کو معلوم ہو جائے گا کہ اُس کے پاس ایک ایسا منتر ہے جس سے وہ اپنے اِردگرد کی چیزوں کی باتیں با آسانی سن سکتا ہے۔ وہ یہ راز کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے جواد کے جوتوں کی حالت اور ان کی آہ و بکا سن کر افسوس ہو رہا تھا۔

''جواد! میری بات سنو۔'' عمر نے جواد کو مخاطب کیا۔

''کہو کیا بات ہے؟'' جواد بولا۔

''تم اپنے جوتوں کی حالت دیکھ رہے ہو۔''

''ہاں دیکھ رہا ہوں۔'' جواد کا لہجہ تلخ تھا۔

''یہ جوتے تمہارے پاؤں کی حفاظت کرتے ہیں ہونا تو یہ چاہیے کہ تم بھی ان کی حفاظت کرو، ان کا خیال رکھو، مگر تم شاید ایسا نہیں کرتے۔''

''تم بھی تو اپنے جوتوں کو دیکھو۔'' جواد فوراً بولا۔

''ہم دونوں ہی غلط کر رہے ہیں، میں تمہارے جوتوں کی باتیں سن چکا ہوں۔'' بے اختیار عمر کی زبان سے یہ جملہ ادا ہوگیا۔

''کیا مطلب؟'' جواد نے حیرت کا اظہار کیا۔

''یہ بات تو میں نے ایسے ہی کہہ دی ہے، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان جوتوں کو زبان مل جائے تو یہ ہمارے بارے میں کیا باتیں کریں گے۔'' عمر نے کہا۔

''تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو، سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟'' جواد نے اصل بات بتانے کے لیے اصرار کیا۔

''میں...... میں کچھ بھی تو نہیں چھپا رہا، میں سچ بول رہا ہوں۔'' عمر یہ کہہ کر اپنی جماعت کی طرف بڑھنے لگا تو جواد اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔

''مجھے یقین ہے کہ بات کچھ اور ہے۔'' جواد نے عمر کو گھورتے ہوئے کہا۔

عمر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بریک ختم ہونے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ دونوں جماعت کی طرف بڑھے۔ اُردو کے پیریڈ کا آغاز ہوا تو جواد بار بار عمر کو گھور رہا تھا۔ عمر کی توجہ پڑھائی کی جانب نہ تھی۔ اُس نے جیومیٹری بکس میں رکھے پین اور پنسل کو دیکھا، دونوں حرکت کر رہے تھے۔ عمر سمجھ گیا تھا کہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ عمر نے ''بول بول بول، اپنے لب کھول، بول بول بول، اپنے لب کھول۔'' منتر دھیمی آواز میں پڑھ کر جیومیٹری بکس پر پھونکا تو وہ پین اور پنسل کی باتیں نہ سن سکا۔

(عمر پین اور پنسل کی باتیں کیوں نہیں سن سکا تھا، یہ جاننے کے لیے اگلی قسط پڑھیے۔)



اندھیرے سے اُجالے تک

نذیر انبالوی

ایمبولینس ہوٹر بجاتی ہوئی لاہور کی حدود سے نکلی تو رات کے دس بج چکے تھے۔ مریض کا ایک ساتھی ڈرائیور کے ساتھ جب کہ دُوسرا مریض کے پاس بیٹھا تھا۔ مریض کے کراہنے کی آواز وقفے وقفے سے ایمبولینس میں گونج رہی تھی۔ لاہور سے مریدکے تک کے سفر میں مریض کے دونوں ساتھیوں نے نہ تو ڈرائیور سے کوئی بات کی تھی اور نہ انھوں نے ایک دُوسرے کو مخاطب کیا تھا۔ دونوں کی نظریں اپنے مریض پر اور ڈرائیور کی نظر سڑک پر تھی۔ ایمبولینس کے اندر چھوٹے چھوٹے جملے لکھے تھے۔ مریض کے ساتھ بیٹھا آدمی ان جملوں کو بغور پڑھ رہا تھا۔ کچھ جملے یوں تھے۔

''اے اللہ ہم پر رحم فرما۔''

''شفا اللہ کی طرف سے ہے۔''

''اے اللہ ہمیں ہدایت کا راستہ دکھا دے۔''

''اے اللہ ہمارے گناہ بخش دے۔''

''میں جب بیمار ہوتا ہوں تو اللہ ہی مجھے شفا دیتا ہے۔''

وہ ابھی یہ جملے پڑھ رہا تھا کہ مریض نے کراہتے ہوئے کہا۔

''ہائے میں مر گیا...... ہائے میری ٹانگ...... ہائے میری ٹانگ......''

اس کے پاس بیٹھے ساتھی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ مریض مسلسل کراہتا رہا۔ ایمبولینس جب مریدکے کی حدود سے باہر نکلی تو مریض کے ساتھ بیٹھے ہوئے ساتھی نے پستول نکال کر ڈرائیور کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ ڈرائیور بوکھلا سا گیا۔

''ہم جیسا کہتے ہیں ویسا ہی کرو اگر چالاکی دکھائی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''ایمبولینس چاہتے ہیں۔'' ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی بھی بول پڑا۔

''ایمبولینس۔'' ڈرائیور نے دہرایا۔

''ہاں ہمیں ایمبولینس چاہیے۔'' پستول ہاتھ میں تھامے شخص نے چلاّ کر کہا۔

''میں...... میں...... ویسا ہی کروں گا جیسا تم چاہو گے...... بتاؤ...... بتاؤ...... مجھے کیا کرنا ہے؟''

''بہت اچھے...... تم ایمبولینس کو دائیں طرف ویرانے میں لے چلو۔''

یہ سن کر ڈرائیور نے اگلے ہی لمحے ایمبولینس کو ویرانے میں

اتار دیا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔

''اوئے یہ ہوٹر تو بند کرو۔'' مریض بھی اسٹریچر سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اگلے ہی لمحے ہوٹر خاموش ہو چکا تھا۔

''استاد! اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے آدمی نے مریض سے پوچھا۔

''اسے کچھ نہیں کہنا۔''

''استاد! کہیں یہ بعد میں ہمارے لیے خطرہ نہ بن جائے۔''

''نہیں بنے گا خطرہ...... یہ عقل مند ہے۔'' مریض نے ڈرائیور کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

چند منٹوں بعد وہ ڈرائیور کو ویرانے میں پھینک کر ایمبولینس لے کر بڑی سڑک تک پہنچ چکے تھے۔ تینوں بہت خوش تھے۔ ایمبولینس چھیننے کا یہ منصوبہ راجو کا تھا۔ وہی مریض بنا تھا۔ اُس نے چند دنوں قبل ایمبولینس چھیننے کا منصوبہ اپنے دوستوں جمالا اور طفیل کے سامنے رکھا تھا تو جمالے نے حیرت سے کہا تھا۔

''لو اب گاڑیاں چھینتے چھینتے ایمبولینس چھیننے کی واردات کریں گے۔''

''ارے بدھو اس میں حرج ہی کیا ہے۔'' راجو بولا۔

''اس واردات کے لیے مریض کون بنے گا؟'' طفیل نے سوال کیا۔

''میں مریض بنوں گا۔'' راجو فوراً بولا۔

''تمہیں مریض بننے کی کیا ضرورت ہے، تم تو پہلے ہی مریض لگتے ہو۔''

جمالے نے اتنا کہا تو راجو بولا۔

''بکومت......''

انہوں نے رات ساڑھے نو بجے کے قریب میو ہسپتال سے ایمبولینس کرائے پر حاصل کی تھی۔ طفیل اس وقت ایمبولینس اڑائے جا رہا تھا۔

''ابے گدھے ہوٹر تو بجاؤ تاکہ پتہ چلے ایمبولینس سڑک پر دوڑ رہی ہے۔''

''لو جی ہوٹر چلائے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر طفیل نے ہوٹر کا بٹن آن کیا تو رات کی خاموشی میں ہوٹر کی آواز دُور تک سنائی دی۔

''راجہ! ایمبولینس کو بیچنا کہاں ہے؟'' جمالا بولا۔

''مال مارکیٹ میں لے کر نکلو تو خریدار بہت...... بس ایک مرتبہ ایمبولینس ٹھکانے تک پہنچ تو جائے۔'' راجو نے کہا۔

''اس مرتبہ جگو کو یہ مال نہیں بیچنا چاہیے۔'' طفیل نے کہا۔

''وہ کیوں؟'' راجو سوالیہ نشان بن گیا۔

''پچھلی بار اس نے جیپ کے پیسے کم دیے تھے۔'' طفیل بولا۔

''ٹھیک ہے کسی نئے گاہک کو دیکھ لیں گے۔'' راجو نے کہا۔

''کچھ دُور جا کر پولیس چیک پوسٹ ہے وہاں سے نکلنے کے لیے ابھی بندوبست کر لو۔'' جمالا بولا۔

''بندوبست کیا کرنا ہے، میں پھر مریض بن جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر راجہ فوراً اسٹریچر پر لیٹ گیا۔ اُس کے پاس جمالا تیمار دار کی حیثیت سے بیٹھ چکا تھا۔

''کراہتے کیوں نہیں ہو...... مریض بھلا اس طرح کے ہوتے ہیں۔''



''ہائے میں مرگیا...... ہائے میری ٹانگ۔'' یہ سن کر تینوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''بہت خوب...... تم تو بہت بڑے ایکٹر ہو...... یہ وارداتیں چھوڑو اور کسی ڈرامے میں اداکاری شروع کر دو۔'' طفیل نے کہا۔

وہ انہی باتوں میں مصروف پولیس چیک پوسٹ تک پہنچ چکے تھے۔ پولیس نے سڑک کے درمیان رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی۔ گاڑیاں گزرنے کے لیے ایک طرف تھوڑا سا راستہ تھا۔ ایک پولیس اہلکار نے ایک اشارہ جس پر ''پولیس'' لکھا تھا۔ ایمبولینس کے سامنے لہرایا۔ طفیل نے ایمبولینس ایک طرف روک لی۔ پولیس والے نے ونڈ سکرین سے ایمبولینس میں جھانکا۔ ایمبولینس سے ہلکی ہلکی آواز ''ہائے میری ٹانگ...... ہائے میں مرگیا۔'' سنائی دے رہی تھی۔ پولیس اہلکار جب اپنی تسلی کر چکا تو طفیل کو گھورتے ہوئے بولا۔

''جاؤ......''

یہ سن کر طفیل نے ایمبولینس آگے بڑھا دی۔ جب وہ پولیس چیک پوسٹ سے چند میٹر دُور کیے تو جمالا مسکرا کر بولا۔

''مریض صاحب اب اٹھ جاؤ۔''

''یار آرام کرنے دو۔''

''آرام تو اپنے ٹھکانے پر ہی جا کر کریں گے۔'' طفیل بولا۔

''ٹھکانے پر پہنچ کر تو آرام کرنا ہی ہے۔ بس اب ذرا کمر سیدھی تو کر لوں۔'' اس سے قبل کہ طفیل کوئی جواب دیتا ایمبولینس ایک ٹرک سے ٹکراتے ہوئے بچی۔

''طفیل رفتار کم رکھو۔ یہ نہ ہو تمہیں اسی ایمبولینس میں ہسپتال پہنچانا پڑے، رفتار کم کر دو۔''

ایمبولینس کے میٹر کی سوئی ایک سو دس سے اسی کے ہندسے پر واپس آ گئی۔ اب ایمبولینس میں مکمل خاموشی تھی۔ ہوٹر کی آواز کے باوجود راجو اور جمالا سو گئے تھے۔ اب وہ گجرات کی طرف بڑھ رہے تھے۔ راستے میں جہاں بھی کوئی پولیس چیک پوسٹ آتی تینوں ایک فرضی ڈرامے کے کردار بن جاتے۔ ان کا ٹھکانہ اب بہت قریب تھا۔ اسٹریچر پر لیٹے ہوئے جب راجہ نے ''ہائے میرا دل'' کہا تو دونوں یہی سمجھے کہ وہ مذاق کر رہا ہے راجو نے دُوسری بار ''ہائے میرا دل۔'' کہا تو طفیل نے مسکرا کر کہا۔

''لگتا ہے اس پر اداکاری کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ پہلے کہتا تھا ہائے میری ٹانگ اور اب ہائے میرا دل کی رٹ لگانے لگا ہے۔ یہ کامیاب اداکار بن سکتا ہے۔''

میں مذاق یا اداکاری نہیں کر رہا...... میں تکلیف میں ہوں...... میرا دل ڈوبا جا رہا ہے، میرے دل میں درد ہو رہا ہے۔''

راجو کی سنجیدگی سے دونوں کے چہروں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

''راجہ ہمارا ٹھکانہ آنے ہی والا ہے۔ وہیں پہنچ کر کوئی دوا وغیرہ کھا لینا۔'' طفیل نے ایمبولینس کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ایمبولینس کا رُخ ٹھکانے کی بجائے کسی ہسپتال کی طرف کر دو...... ہائے میرا دل گیا...... ہائے میں مرگیا...... ہائے...... مجھے بچاؤ...... مجھے ہسپتال لے چلو...... ہائے میں مرگیا۔''

دونوں سوچ میں پڑ گئے کہ اگر ہسپتال گئے تو کہیں پکڑے نہ جائیں۔ انہیں اپنے دوست کی خاطر یہ خطرہ بھی مول لینا پڑا۔ وہ اس علاقہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے ہسپتال کی تلاش میں انہیں کوئی دقت نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد ایمبولینس ایک چھوٹے سے ہسپتال کے سامنے کھڑی تھی۔ دونوں راجو کو سہارا دے کر ایمرجنسی وارڈ میں لے گئے۔ راجو کی ایک ٹانگ پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔ راجو کو جب بیڈ پر لٹایا گیا تو ''ہائے میرا دل گیا۔'' کا جملہ اس کی زبان پر تھا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

''آپ انہیں فوراً لاہور لے جائیں یہاں ان کا علاج ممکن نہیں ہے۔ آپ نے دیر کی تو مریض کی جان بھی جا سکتی ہے۔ انہیں دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔''

کچھ ہی دیر بعد ایمبولینس لاہور کی طرف جا رہی تھی۔ ہوٹر ہٹو بچو کا شور مچا رہا تھا۔ ایمبولینس وہی تھی۔ اس میں سوار بھی وہی تھے۔ اسٹریچر بھی وہی تھا۔ اب فرق یہ تھا کہ اسٹریچر پر لیٹا مریض پہلے نقلی اور اب اصلی تھا۔ اسپیڈ و میٹر کی سوئی ایک سو بیس کے ہندسہ کو چھو رہی تھی۔ طفیل کی نگاہیں سڑک پر اور جمالا

کی نظریں راجو پر تھیں۔ ان کی منزل پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی تھی۔ تینوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ راجو کے مریض بننے کا ڈرامہ حقیقت کا روپ دھار لے گا۔ راجو کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ زندگی سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ ایمبولینس نے جب دریائے راوی کا پل عبور کیا تو جمالا بولا۔

''راجو بس اب ہم ہسپتال پہنچنے ہی والے ہیں، ہمت مت ہارو۔''

راجو! نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس نے ایمبولینس میں لکھے جملے دہرائے۔

''اے اللہ اپنا رحم فرما۔''

''میں جب بیمار ہوتا ہوں تو اللہ ہی مجھے شفا دیتا ہے۔''

''اے اللہ ہمارے گناہ بخش دے۔''

''اے اللہ ہمیں ہدایت کا راستہ دکھا دے۔''

راجو کے ہونٹوں کے ساتھ ساتھ جمالا کے ہونٹ بھی حرکت میں تھے۔ اُس کے لبوں پر بھی دُعائیں تھیں۔ دو گھنٹے میں ایمبولینس انہیں پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی لے آئی تھی۔ ایمبولینس نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ ہسپتال کے باہر لگے گھڑیال میں رات کے دو بج رہے تھے۔ راجو کو ابتدائی طبی امداد کے بعد آئی سی یو وارڈ میں داخل کر دیا گیا۔ دو گھنٹے بعد ڈاکٹر نے جب جمالا اور طفیل کو یہ بتایا کہ ان کے مریض کی حالت خطرے سے باہر ہے تو ان کے سر اپنے رب کے حضور جھک گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ پانچ بجے تک راجو بات چیت کرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ دونوں جب راجو کے سامنے گئے تو اس نے پوچھا۔

''ایمبولینس کہاں ہے؟''

''ہماری جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں ایمبولینس کی پڑی ہے۔تم اب کیسے ہو؟'' جمالا نے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں...... بتاؤ ایمبولینس کہاں ہے؟'' راجو نے دوبارہ پوچھا۔

''ایمبولینس باہر کھڑی ہے۔'' طفیل بولا۔

''ایمبولینس کو وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے ہم نے اسے کرائے پر لیا تھا۔ میں نے بُرے کام چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟ بولو...... جواب دو۔''

''ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' دونوں یک زبان ہو کر بولے۔

''ہم سب پہلے خود کو پولیس کے حوالے کریں گے اور اپنے جرائم کا اعتراف کریں گے۔ جب ہم اپنے جرائم کی سزا کاٹ لیں گے تو تب ایک نئی، صاف ستھری اور شریفانہ زندگی کا آغاز کریں گے۔'' یہ کہتے ہوئے راجو کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ دونوں اپنے دوست کی باتیں سن کر باہر کی طرف بڑھے۔ سڑکوں پر زیادہ رش نہ تھا اس لیے وہ دس منٹ ہی میں پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی سے میو ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ دونوں کو اُس لمحے یوں لگا کہ جیسے وہ اندھیرے سے اُجالے میں آ گئے ہوں۔



ہونہار مصور

غبارے والا



عنہا سیف، چیچہ وطنی (پہلا انعام :175 روپے کی کتب)



فائزہ شہزاد، لاہور (دُوسرا انعام :150 روپے کی کتب)



زوہیب شہزاد، صادق آباد (تیسرا انعام :125 روپے کی کتب)



ازما بنت اشرف، ملتان (چوتھا انعام :100 روپے کی کتب)



صباء ستار علوی، راول پنڈی (پانچواں انعام :90 روپے کی کتب)



خنساء اشرف، لاہور (چھٹا انعام :75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: عائشہ انعم، لاہور۔ زوہا فاطمہ، صادق آباد۔ محمد حسنین معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ تہنیت شفقت، لاہور۔ اویس علی، گجرات۔ لیلیٰ جلیل الرحمان یوسف زئی، نوشہرہ۔ محمد فیاض الحسن، تلہ گنگ۔ یشرح انوار، گوجرانوالہ۔ ایمن فاطمہ، ملتان۔ عبداللہ ارشد، زرناب جمال، گوجرانوالہ۔ محمد عکراش، لاہور۔ عکاشہ فاطمہ، گجرات۔ عمران رمضان کمبوہ، قصور۔ طوبیٰ خان، رابعہ تبسم، صادق آباد۔ سید دانیال قمر شاہ، بہاول پور۔ عبدالحنان سیف، چیچہ وطنی۔ نبیہ کامران، لاہور۔ محمد سعید صدیقی، کراچی۔ علی حیدر، گوجرہ۔ علی اسد چوہدری، لاہور۔ مریم خان، جھنگ۔ ارسلان سلیم، نوشہرہ۔ زرینہ ملک، کراچی۔ محمد آریز علی، تونسہ۔ محمد ثاقب عادل، بسیلہ۔ اقصیٰ نورین، کھاریاں۔ لائبہ خان، رابعہ خان، گوجرانوالہ۔ آمنہ سراج، اسلام آباد۔ ماہ نور جمیل، میر پور۔ حسنین شیراز خان، میاں والی۔ مومنہ عتیق، گوجرہ۔ ماریہ وسیم، کراچی۔ عمر فاروق، لاہور۔

جولائی کا موضوع
موسم برسات

اگست کا موضوع
جشن آزادی

آخری تاریخ 8 جون

آخری تاریخ 8 جولائی

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

بلاعنوان



اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 جون 2012ء ہے۔



مئی 2012ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔



- ڈبل سواری گول۔ (دانش علی خان، میاں والی)
- نیچے والا بوجھ اٹھائے، اُوپر والا پوائنٹ بنائے۔ (صارم ندیم، حیدرآباد)
- اِسے کہتے ہیں ایک اور ایک گیارہ۔ (محمد طلحہ نیازی، کوئٹہ)
- میں چھوٹا سا اِک لڑکا ہوں، پر کام کروں گا بڑے بڑے۔ (خلیل حسان، اٹک)
- واہ واہ! کیا کہنے آپ کی ذہانت کے۔ (مدثر کرم شہزاد، سرگودھا)